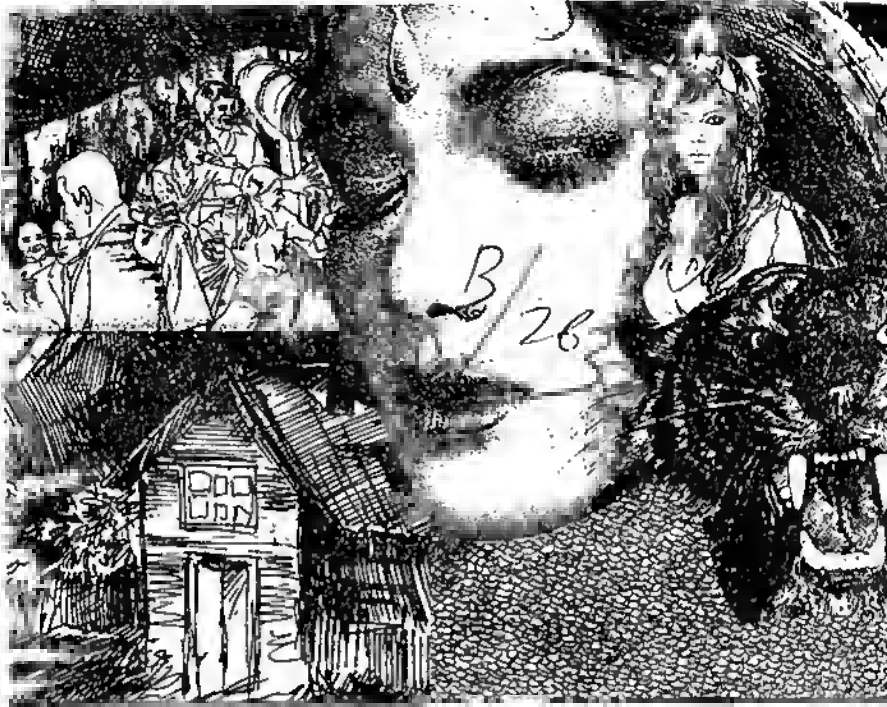


خوفناک اور دہشتناک مختلف کہانیاں

روپ بدلنے والی





B/26

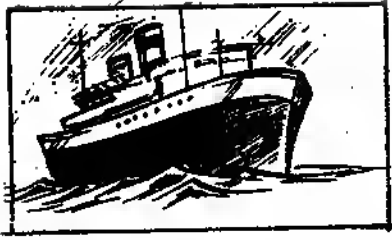
یہی کچھ ہمارا خاندان تھا۔ اسٹور روم بہن گارڈن میں واقع تھا۔ اسٹور روم کے فرش تلے ہم نے اپنا مل کھودا اور یہی مل کر کوئی غریبوں کو اپنے شب و روز بسر کرتے

تھے۔ چوبیس سو تیس ہزار روپے کی مالیت پر میرا بھائی باہر باغ میں نکلے اور پوشی فوجی حکمران کے عقب میں گئے۔ روشتوں میں روشتوں کے لیے اپنے خستہ بھوک گئی تھی اور ہماری نظرس جہوں پر بندوں اور سرگوشوں وغیرہ کو تلاش کر رہی تھیں۔ ہمیں شاید وہ ہم سے زیادہ جالاک تھے۔ اس لیے کوئی ہمارے ہاتھ نہ آیا اور ہم بھوکے ہی پر تھلے پوشی فوجی کے کمرے کھانے پینے کی اشیا جانا آسان تھا۔ اس لیے ہم اسٹور روم کی آڑ میں چسپ کر صورت حال کا جائزہ لینے لگے۔

پوشی فوجی کا بادر جی ایک مجسم خیمہ محض تھا۔ اس میں لوگوں پر کشت لگ رہا تھا۔ وہ کچھ دنوں بعد آکر زمین سے جڑیں اکھاڑتا۔ یہ کھانے والی جڑیں تھیں۔ بعض اوقات ایک آدھ جڑ پر پانی تو میں ہنسنے پر رہتی تھی۔

کیا کبھی آپ نے ڈائری لکھی ہے؟ اکثر مرد ڈائری لکھتے ہیں اور میں بہت سی ایسی معزز خواتین کو بھی جانتی ہوں جو بلا ناغہ اپنی ڈائری لکھتی ہیں۔ مردوں کے ڈائری میں تو مجھے اندازہ نہیں لیکن خواتین کی ڈائری میں اندازہ سے بھری ہوتی ہیں۔ کیونکہ ایک عورت کی زندگی میں انتظار کے سوا اور کچھ ہی کیا ہوتا ہے۔ لیکن میں جو ڈائری آپ کو پڑھوانے چاہتی ہوں وہ ایک ایسی خاتون کی ڈائری ہے جو لڑکی کی تھی۔ دو سرے لفظوں میں ایک ایسی لوسری کی ڈائری جو عورت کی تھی۔ عورت سے ہاں! میں ایسی رویا ہوں جو عورت کی تھی۔ عورت سے رویا بننے پر مجبور ہوئی۔ مجھے کچھ نہیں آتی کہ اس قصبے کا آغاز کس طرح ہوا؟ میں بھی ایک لوسری ہوں اور مجھے زبان کی نزاکتوں کو کیا پتا؟ کچھ سننے سے پہلے ظاہر ہے مجھ دک سوچنا پڑے گا۔

ہم لوگ پوشی فوجی کے اسٹور روم میں فرش تلے تنگ سی جگہ پر رہتے تھے۔ میں 'میرا بھائی' 'اوا جان' 'ای'



اس گنڈھڑی پر چل دی جو صوبہ کے درختوں میں سے ہوتی ہوئی جنگل میں کم ہو جاتی تھی۔ ایک خاص مقام پر جا کر ہم رک گئیں۔ اب ہمیں پوشی فوجی کا انتظار تھا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ہمیں اس کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ معمول کے مطابق شام کی چل قدمی کے لیے گھر سے باہر آیا تھا۔ پہلے میں نے اسے دیکھا۔ وہ گھر کے سادہ کپڑوں میں تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا شاید اپنی بیوی کی جدائی پر اواس ہے۔ وہ کبھی بھی بہت خوبصورت اور نازک اندام۔ میں سوچنے لگی کہ یہ میں کیا کرنے جارہی ہوں۔ میں شکوہ سے اس کا شور مچانے والی تھی۔ اب وہ اپنے تارک کر کے میں بیٹھ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کی غمزدگی کی یکسانیت دور کرنے کوئی نہیں آئے گا۔ ”ہاں کوئی نہیں آئے گا۔“ میں نے قدرے اونچے آواز میں کہا۔

شاید اس نے میری آواز سن لی تھی یا غلاموں کو دیکھ لیا تھا کیونکہ ان کی قافلوں کے شرخ رنگ اندھیرے میں بھی چمک رہے تھے۔ وہ بے قرار ہو کر ہماری جانب لپکا۔ میری غلاماں کمر بھر کر گئیں۔ انہوں نے چہرے کھما کر اپنی پچھلیوں کی آڑ میں کر لیے۔ اس کی آنکھیں مجھ سے دوچار ہوئیں۔ میری آنکھوں میں طبعی کشش تھی جس سے میں بخوبی آگاہ تھی۔ وہ ان نظروں کا اسیر ہو گیا۔ وہ میرے قریب آیا تھا۔ میں پلٹ گئی مگر اس سے پہلے کہ میں اپنی قبائلیت کو بھانپنے لگی، اس نے اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھ کر کہا: ”رکو!“

مجھے لگا جیسے کسی چہرے دان میں پھنس گئی ہوں۔ میری غلاماؤں نے پریشان ہو کر شور مچایا۔ میں نے کہا: ”پلیز! مجھے جانے دو۔“

”نہیں۔“ اس نے ایک عزم کے ساتھ کہا۔ ”تم

دے دی تھی۔ میرا بھائی چہرے بون کا ایک خوبصورت جوان تھا۔ ماں ایک تیس اور نازک طبع خاتون تھیں۔ ان کے غٹھوں تک لمبے بالوں میں چاندی کے آثار لہراتے تھے۔ دادا کی وجہات بے حد و حساب تھیں۔ وہ کیڑے رنگ کی پوشاک پہنتے تھے۔ میں نے ازراہ غفلت ماں سے کہا: ”ماں! کیا ہو اگر وہ ہم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ لے؟“

ماں میرے اس سوال پر شرمندہ سی ہو گئیں اور دادا پر چبھنے لگے کہ بات کیا ہے؟ میں نے وضاحت کی تو ہنس کر گھٹنے لگے: ”وہ انسان ہے۔ اسے وہی کچھ نظر آئے گا جسے وہ دیکھنا چاہے گا۔ کیا تم خوش ہو رہی؟“

”ہاں دادا! یہ سب کچھ بہت خوبصورت ہے۔ میری سوچوں سے بھی زیادہ۔ لیکن اس کی کیا ہے جس کے لیے یہ سب کچھ کیا گیا ہے۔“

میری یہ بات سن کر بھائی نے ناگواری کا اظہار کیا تو دادا نے اسے سرزنش کی: ”اوپس ہو بھئی! جس قدر تمناؤں اور ہمتی! اپنی بہن کی خوشیوں کی خاطر۔“

”کیونکہ“ میری ماں نے لقمہ دیا۔ ”اسے ایک آدم زاد سے محبت ہو گئی ہے۔ اور ہم یہ سب کچھ اسی کے لیے کر رہے ہیں۔“

”میں جانتا ہوں۔“ بھائی نے کہا۔ ”میں اس کا اچھا بھائی اور آپ کا اچھا بیٹا ہوں گا۔ لیکن میں افسردہ بھی ہوں۔“

”وہ آدم زاد ہماری مدد کرے گا۔“ دادا نے کہا۔ ”وہ ہمارا روزی رسا بن جائے گا اور شاید ہمیں کوئی اعلیٰ سرکاری منصب مل جائے۔“

”میں آپ کو لوگوں کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔“ بھائی نے اداسی سے کہا۔

”تمک ہے۔“ دادا نے اطمینان ظاہر کیا۔ پھر مجھ سے پوچھا: ”کیا تم اگلے مرحلے کے لیے تیار ہو رہی؟“

”ہاں دادا۔“ میں نے کہا۔ ”میں سب کچھ کر گزروں گی۔“

اگلے روز جب شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تو میں نے دادا کی ہدایت کے مطابق اپنی غلاماؤں کو ساتھ لیا اور

دادا نے مجھے ایک چھوٹی سی سفید گیند دی جو اندھیرے میں چمکتی تھی۔ میں نے تجسس سے اسے دیکھا۔

”تمہارے کھیلنے کو۔“ دادا نے کہا۔ ”تم اب ایک دوشیزہ ہو۔“ اس لیے مزید اپنے بھائی کے ساتھ نہیں کھیل سکتیں۔ مزید برآں تمہارے ایسی رو بہ عورت کے لیے اس طرح کی گیند بیڑی روایتی ہے۔“

”مگر دادا! مجھے تو گیند کے ساتھ کھیلنا قطعاً پسند نہیں۔“

”تم ابھی نہیں جانتیں کہ تمہارے لیے کیا اچھا ہے اور کیا برا۔ اسے اپنے بہرہ میں رکھ لو۔ جلد یا بدیر تمہیں اس کی ضرورت پڑے گی۔“

جادو کے ذریعے ہم نے اسنو روم کے فرش کے نیچے کی خالی جگہ پر بے شمار کروڑوں اور دو روپے والا عالی شان محل تعمیر کر لیا تھا۔ فرش پر ایرانی قالین، دیواروں پر دیبھیں، پردے، نوکر چاکر، باندیاں، قیمتی اور نایاب نکلی کا فرنیچر جس پر سنہری روغن کیا گیا تھا، دیدہ زیب مسند قوٹوں میں اگلس و گلاب کی قباہیں، مرمرین ساغر، کچھوے کے خول سے بنی تنگھیاں، تختی اور طلائی ظروف جو یوں چمکتے تھے جیسے کسی خیموں کی تہ میں دیکھتے سکر۔ نہیں! ہم نے یہ چیزیں بنائی نہیں تھیں! اس کچھ ایسا کر دیا تھا کہ یہ سب کچھ نظر آتا تھا۔ بس میں اس کی وضاحت نہیں کر سکتی۔ ہم نے اپنے قصر کو ان عالی شان اشیاء اور مختلف النوع نوادہ سے آراستہ کرنے کے بعد ارد گرد خوبصورت چمن بنایا جس میں رنگ رنگ پھول اور شجر تھے، تالاب تھے اور سدا بہار کی جھاڑیاں اپنی بہار دکھا رہی تھیں۔

اگر میں اب بھی ایک رو بہ ہی ہوتی تو یہ سب کچھ ایک رو بہ کا خواب ہوتا مگر میرا خواب تو وہ تھا۔ پوشی فوجی! ہمارے عالی شان محل پر سوچ چمکتا تھا چاند اپنی کرنیں بکھیرتا اور ستارے ٹٹٹاتے تھے جیسے کہ اصلی دنیا میں یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ ہمارے بے شمار خدام تھے جو سب کے سب مستعد، مہذب اور عقلمند و رضا کے پیکر تھے۔

ہم سب نے خود کو ایک آدم زاد خاندان کی شکل

جنگل کا راستہ دو مندروں کے درمیان سے گزرتا تھا۔ دونوں جانب دیوار کے گھٹے درخت تھے۔ میں اس کا عقاب کرتی اور جیکے اندھیرے میں اس کے چہرے پر پہلے تاثرات کو دیکھنے کی کوشش کرتی۔

ایک رات میں بید کے چھوٹے سے درخت تلے چلی آئی۔ پوشی فوجی اپنے کمرے میں تھا بیٹھا تھا۔ کمرے کے پردے کھلے ہوئے تھے۔ میرا خیال ہے وہ باغ میں پھیلی چاندنی کو دیکھ رہا تھا۔ شاید اس نے شراب بھی پی رکھی تھی۔ آندھان میں دیکھتے سرخ کوٹوں کی روشنی میں اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ میرے دل میں درد کی ایک لہر اٹھی اور سینے میں کوئی چیز اٹک سی تھی۔ میری آنکھوں سے نہ پ نہپ آنسو گرنے لگے۔ آراٹھی چٹان پر سے ایک سایہ سا پھلا اور میرے قریب آکر رک گیا۔ یہ دادا جان تھے۔ انہوں نے میرے ہتے آنسو دیکھ کر کہا: ”تم مریاؤ گی! کھانا نہ چٹا۔ یہ تم کیلارنگ لگا بیٹھی ہو!“

”مجھے پروا نہیں۔ میں اس شخص سے محبت کرتی ہوں۔“ میں سسک پڑی۔

وہ چند ثانیے خاموش رہے، پھر بولے: ”اس کے باوجود بھی تم ایک لومڑی ہو!“

”دادا! ہم تو مڑیاں ہیں اور ہمارے پاس جادو ہے۔ کیا ہم اسے اپنے پاس نہیں لاسکتے؟“

”کیا تم بچہ ایسا جانتی ہو؟“ دادا نے پوچھا۔

”ہاں! ورنہ میں مریاؤں گی۔“

”اگر تم یہ چاہتی ہو تو ہم ضرور وہ کریں گے جو اس سے پہلے نہیں ہوا۔“ دادا نے بڑے عزم سے کہا اور اٹھ کر چلے گئے۔

-----○☆○-----

جادو کو رو بہ عمل لانے کا مرحلہ بہت سخت تھا۔ ہم سب کو اس پر بہت وقت صرف کرنا پڑا۔ میں ایک رو بہ تھی، لیکن میرے دادا نے مجھے عورت بنادیا۔ میری سیاہ زلفیں اس قدر نرم و ملائم تھیں جیسے کسی جھرنے کا کرتا ہو ادھارا۔ اور دراز اتنی کہ گھٹنوں سے نیچے تک آتی تھیں۔ ایک رات میں نے صبر سے ہونے پانی میں اپنا چہرہ دیکھا۔ اپنے حسین اور دلنور چہرے پر چٹکی چاندنی دیکھ کر میں خود بخود شرمائی۔

اوٹ میں ہے۔ اگر یہ بدلیاں چاند کے چہرے سے ہٹ جائیں تو میں اسے جی بھر کے دیکھوں۔ میں اس کے ہاتھی اشعار سن کر مسکراؤں۔ تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی پھر میں نے سوچا اگر میں کچھ نہ بولی تو وہ جان جائے گا کہ وہ کسی عجیب و غریب صورت حال سے دوچار ہے۔ وہ ارد گرد دیکھے گا۔ ممکن ہے وہ خود کو اپنے گھر کے بجائے مٹی میں تھرا اور مٹری کے چالوں میں پھنسا دیکھے۔ جیسے کہ میں اسے اپنی دوسری نظر سے دیکھ رہی تھی۔

”آپ اس جانب تشریف لے آئیے۔“ میں نے بہت جھجھک کر کہا۔ میری جانب سے یہ پیش کش کچھ قفل از وقت تھی۔ لیکن مجھے اس کی توجہ جانے کا کوئی اور طریقہ نہ سوجھا تھا۔ پوشی فوجی کچھ دیر پکس بچکا تاربا پھر اندھ کر میرے پاس چلا آیا۔

ایک عالی مرتبت خاتون شادی تیار ہوئی ہے اس لیے میری خادماں بھی میرے پاس آگئیں۔ لیکن پھر وہ سو گئیں۔ ان میں سے ایک تو بٹلے بٹلے خراٹے بھی لے رہی تھی۔ میرے ہاتھ کی پٹیمیں اب بھی میرے چہرے کے سامنے تھی جسے پوشی فوجی نے آہستہ سے پکڑ کر ایک جانب رکھ دیا۔ اس نے میرے ہاتھوں کو پکڑا اور ان پر نہایت جھٹ کر دی۔ میں نمال ہو گئی۔

اس سے پہلے میری جڑی میرے بھائی کے ساتھ تھی۔ لیکن اس وقت ہم بہت کم سن تھے۔ ایک آدم زادو کے ساتھ جوڑی کوئی ایسا مختلف تجربہ نہ تھا۔ پھر بھی یہ مجھے بہت مختلف اور بہت مزیدار لگا۔ پوشی فوجی مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا۔ اپنے بکھرے بالوں کے ساتھ تو وہ اور بھی خوبصورت لگتا تھا۔ میں اس کے جمال کو دیکھ کر خوشی سے رو پڑی۔ اس نے اٹکیوں کی پروں سے میرے آنسو پونچھے تو میں سسک پڑی اور اپنا چہرہ اپنے گھسوں میں پھپھایا۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے اضطراب سے پوچھا۔
”وہ کس قدر اداس اور غمگین ہوئی!“ میں نے اپنے آپ سے کہا۔

”کون؟“ اس نے پوچھا۔
”تمہاری بیوی۔“ میں نے کہا۔

نے اشارہ کیا۔ خادماں بھی میرے ساتھ ہی پروں کے عقب میں چلی ہو گئیں۔ چند ہی خانے گزرے تھے کہ پہلو کا دھندلاہٹا۔ مجھے اپنے بھائی کی آواز سنائی دینی۔ ”بھائی! چلتا ہوں کہ آپ کے خیر مقدم کو صرف میری ہمشیر ہی تھیں۔ دراصل مجھے ابھی ابھی پتہ چلا ہے کہ آپ ہمارے قریب خانے کو روک بیٹھے آئے ہیں۔“ میں پردے کی دوسری جانب تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ پوشی فوجی نے کوئی اشارہ کیا ہے۔ چند لمبے بند بھائی نے سلسلہ کام جوڑا: ”میں ی پوشی کا پوتا ہوں۔ ان کی جانب سے میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ آج کی رات ہمیں شرف میرانی بخشے۔“

”بہت ممنون ہوں۔ مجھے پوشی فوجی کہتے ہیں۔“
”ابھی آپ کے کھانے کا انتظام ہو جائے گا۔ اب مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنے دادا کو آپ کی آمد سے باخبر کر دوں۔ وہ اس وقت گوشہ نشین ہیں۔ جو نمی ان کا تھیر ختم ہوگا وہ ہم میں کھل مل جائیں گے۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔“ دروازہ بند ہونے کی آواز آئی اور میں نے اپنے بھائی کے پاس سے دوں کی چاپ سی۔ اس رات پھر میرا بھائی واپس آیا نہاں اور نہ ہی دروازہ کھلا۔ میرے پاس میری سہیلی تھی۔ ہم سب خاموش تھے جبکہ پوشی فوجی نشانی کے احسان سے کسی قدر سیے چپن تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے اپنی پٹیمیں اس انداز سے گرائی کہ پردہ تھوڑا سا ایک جانب سرک گیا۔ میں نے مدھم روشنی میں اس کا چہرہ دیکھا۔

پھر صمان کو کھانا پیش کیا گیا۔ مجھے کھانوں کی اشتیاء کچھ خوشبو آئی۔ عین اسی وقت میرے نتھوں میں ایک مردہ چوہے کی بو بھی آ رہی تھی جس کا انتظام میرے بھائی نے کیا تھا۔ صمان نے کھانا بڑی رغبت سے کھلیا اور خشک چڑے سے پر سے بارش کا پانی بہا۔ پانی کی یہ صورت صرف مجھے نظر آ رہی تھی جبکہ پوشی فوجی کے لیے تو یہ انتہائی صاف ستھرا پانی تھا جو سرسراہٹ میں سے پیش کیا گیا تھا۔

کھانے سے فراغت کے بعد پوشی فوجی نے پردے کا جانب دیکھتے ہوئے ایک خوبصورت لقمہ کے اشعار پڑھے جن کا مطلب کچھ یوں تھا کہ چاند سیاہ بدلیوں کی

شاید اسے بھی اپنی حسین بیوی یاد آتی تھی۔ میرے انگارے وہ کچھ مطمئن سا دکھائی دیا۔ ”تجربہ آپ یہ بتائے کہ آپ کا دولت خاندان کہاں ہے؟ میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔“

”یہ ٹھیک رہے گا۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔
”ہم وہاں رہتی ہیں۔“ میں نے اچھے سے اشارہ کیا۔
وہ میرے جھوٹ کو شاید اسی وقت پکڑ لیتا جب اس نے پگھلنے پر پہلا قدم رکھا تھا، لیکن اس کی نگاہیں تو مجھ پر تھیں۔ اس کا سر اس انداز سے جھکا ہوا تھا جیسے وہ میرے ہاتھ کی پٹیمیں کی اوٹ سے میرے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ویسے بھی اس نے اس جادوئی پگھلنے پر قدم رکھا تھا جو ہمارے قہر کردہ طلسمی عمل تک جاتی تھی۔ یہ ایک طویل پگھلنے تھی۔ بڑی دیر تک ہم چپے رہے تا آنکہ قہر کی روشنیوں دکھائی دیں۔ دلیہ پر قدم رکھتے ہی میں نے ”پنا گھر“ کہا اور اس کا ہاتھ تمام لیا۔ جو میں دیکھ رہی تھی وہ اسے قطعاً نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ بڑی شان سے گداڑ تالیوں پر قدم رکھتا ہوا عمل میں داخل ہو رہا تھا جبکہ میں تو یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ وہ بیٹ کے من ریتھنا ہوا استود روم کے فرش سے بیٹے ہمارے من میں جا رہا تھا۔

میں برآمدے میں کھڑی تھی۔ میرے گرد خداؤں کا جھرمٹ تھا جو مجھے اس کی بے تاب نگاہوں سے محفوظ فرام کیے ہوئے تھیں۔

”تم اس گھر کی بیٹی ہو؟“ اس نے استعجاب سے انداز سے پوچھا۔
”ہاں۔“ میں نے مختصر کہا۔

اس نے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ چمن اور گھر قدیلوں سے جھرنے ہوئے تھے۔ ”آپ کا خاندان تو بہت عالی ہے۔“

وہ میری بیوی میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا استعجاب کرے میں چلا آیا۔ پھر شش و پنج میں پڑ گیا کہنے لگا: ”میرا خیال ہے اب مجھے چلنا چاہیے۔ آپ بخفاغت اپنے گھر پہنچ چکی ہیں۔“

”ارے نہیں! ازراہ کرم آپ تشریف رکھئے۔ میرے گھر والے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہیں گے۔“ میں

کس قدر حسین ہوا! وہ جنوٹ سا ہو گیا۔
مجھے اپنی پٹیمیں یاد آئی۔ میں نے اسے اپنے چہرے کی دھال بنایا۔ اس نے شانے سے ہاتھ ہانک میری کالی تمام لی۔ اس کے یوں چھوٹے سے میں مضطرب ہو گئی۔

”میرا نام پوشی فوجی ہے۔“ وہ خود ہی بتانے لگا۔
”میں یہاں قریب ہی رہتا ہوں۔ لیکن تم اس وقت یہاں جنگل میں کیا کر رہی ہو؟ تمہاری حفاظت کے لیے کوئی مرد بھی مر رہا نہیں ہے۔“

”وہ میں۔۔۔ ہم۔۔۔“ میں ہانک فونیاں مارنے لگی پھر سنبھل کر کہا۔ ”دراصل یہ ایک مقابلہ ہے۔ ہم نے یونی میں اور میری سہیلیوں نے شام کے وقت گنگا پر ٹھیکیں لگائی ہیں۔“

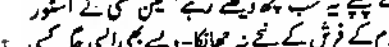
میری خداؤں نے ناتیہ میں سر ہلا دئے۔
”کیا تم نہیں قریب ہی رہتی؟“ اس نے پوچھا۔
”ہاں! میں جنگل کے اس پار۔“ میں نے جواب دیا۔

وہ۔۔۔ جادو کے زیر اثر اس نے ہلچل بھجھک میری اس بات پر نہیں کر لیا۔ حالانکہ جنگل مشکل سے ایک دن کی مسافت کے بعد ختم ہو جاتا تھا اور پینٹا، نگار کے دوران یہ سارا علاقہ اس نے نکال رکھا تھا۔

”پھر بھی بہت اندھرا ہو گیا ہے۔“ وہ ہلا ہلا اس طرح آپ خوانیں کا اکیلے جانا مناسب نہیں۔ میں اسے اپنی عزت افزائی سمجھوں گا اگر آپ ہمارے صمان نہ رہے۔ غریب خانے پر قدم رنجہ فرمائیں۔ میں اتنی دیریں خادم بھیج کر آپ کے گھر اطلاع کروا دوں گا تو وہ آکر آپ کو لے جائیں گے۔“

میں نے اس کے کمرے کے متعلق سوچا۔ مجھے شکبو یاد آئی۔ ”نہیں! یہ ممکن نہیں۔ آپ کو ذمت ہوگی۔“ میں نے کہا۔

میں نے اس کے کمرے کے متعلق سوچا۔ مجھے شکبو یاد آئی۔ ”نہیں! یہ ممکن نہیں۔ آپ کو ذمت ہوگی۔“ میں نے کہا۔



”وہ اسے ہر جگہ تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ انہوں نے چاروں طرف نوکر پھیلادے دیے ہیں۔ آپ خود دیکھیں۔“ وہ مجھے آستین سے پکڑ کر باہر کی جانب کھینچا ہوا۔

”چلو اب سو جاؤ۔“ میں نے کہا۔ اس نے جواب میں کچھ نہ کہا اور رگھیری سوچ میں ڈوبا رہا۔

”تو پھر آئیے! میرے ساتھ جامِ صحت نوش فرمائیے۔“ دادا نے دعوت دی۔ پوشی فوجی جلاتا مل اٹھ کھڑا ہوا۔

لبے میں پوچھا۔

میرے بھائی نے آہ بھری اور بولا: "ہمشیرہ! تم کیوں باہر نہیں نکلتیں؟ کیا تم تیار ہو؟ میں جانتا ہوں کہ تم اپنے بچے کی پرورش کر رہی ہو، لیکن اب تو اس کا دودھ چھڑا دیا گیا ہے۔"

"بیب میرا شوہر پاس ہو تو میں گھر میں رہنا پسند کرتی ہوں۔"

"ہمشیرہ! ہم کھانا کرتے تھے۔ تم اور میں! یاد نہیں؟ ہم چاندنی راتوں میں جنگل میں چھپ چھپ کر رہتے اور چوہے پکڑتے تھے۔ آج کل بچہ کھانا کرتے تھے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا، لیکن مجھے احساس تھا کہ میں بھوت بول رہی تھی۔ بہت کچھ ہو گیا تھا۔

"تو پھر آؤ اب میرے ساتھ باہر چلو۔" بھائی پر وہ بنا لہ اندر چلا آیا اور میرا بازو تھام لیا۔ میرے پیٹے نے اس کی جانب دیکھا اور میں نے خداؤں کو اشارہ کیا کہ ان ابرے سے بے جا نہیں۔

"نہیک ہے۔" میں تیار ہو گئی۔ "ہم ایک بار پھر دوبارہ بیٹے ہیں۔"

اس بار عورت سے دوبارہ لومڑی بننا بے حد اذیت ناک تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میری اصلی چیز اور ہڈی رہی ہو۔ جب میری حالت کچھ بہتر ہوئی تو میں نے بھائی کی جانب دیکھا اور اسلور روم کے فرش سے باہر نکل آئی۔

رات کا آغاز تھا۔ چاند تقریباً پورا تھا۔ مشرق میں ستارے چاند کی روشنی سے ماند ہو گئے تھے جبکہ دور مغرب میں شمعنا رہے تھے۔ ہم باغ میں چلے آئے۔ جب میں باغ میں بنی معنوی آب جو کے چھوٹے سے پل پر پہنچی تو میں چونک پڑی۔ پیچے پانی میں میرا عکس جھلنا رہا تھا۔

بھائی رک گیا اور میرے پاس آکر پوچھا: "کیا بات ہے؟" اس کا انداز سرگوشی کا سا تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا کہ کوئی بات نہیں۔ میں نے اسے یہ بات نہ بتائی کہ پانی میں میرا عکس عورت کا تھا۔

گھر سارا روشن تھا۔ برآمدوں میں مشعلیں لٹکا دی گئی تھیں جبکہ کمروں میں چراغ اور آئینہ ان روشن تھے

"میرا بیٹا! مجھے اسے دیکھنے دو۔" وہ خوشی سے پکار اٹھا۔ "تم کسی قدر شائد عورت ہو۔"

میں نے دایے کو اشارہ کیا کہ پچھلے شوہر کو دکھائے۔ بچے کو دیکھتے ہی یوشی لیوٹی نے کہا: "کتنا پیارا بچہ ہے۔ تم کسی قدر غیر معمولی عورت ہو۔ اتنا صحت مند اور خوبصورت بچہ!"

میں خاموش رہی۔ میں تو یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ ایک گندے جوتوں میں لبوس آوی کی پرچھائیں ہے جو تاریکی میں لومڑی کے پلے کی بند آنکھوں پر بوسہ دے رہا تھا۔

عالم روپاہ میں وقت بڑی انوکھی چیز تھا۔ برسوں بیت گئے۔ ہمارے لئے بھی اور یوشی لیوٹی کے لئے بھی۔ ہمارا بیٹا تیزی سے بڑا ہونے لگا حتیٰ کہ وہ کھانا تیروں کے ساتھ پرندوں کا شکار کرنے اور یا پور سواری کرنے لگا۔ ہم پر تو برسوں کا وقت بیت چکا تھا مگر اصل دنیا میں جہاں سے کہ یوشی لیوٹی آیا تھا وہاں محض چند روز ہی گزر پائے تھے۔ میرے بھائی نے جو ہمارے لئے کھانے کا انتظام کرتا تھا، مجھے بتایا کہ یوشی لیوٹی کی دوسری بیوی سیکے سے لوٹ آئی ہے۔

"اب وہ کیسی لگتی ہے؟" میں نے پوچھا اور اپنے بیٹے کی جانب دیکھا جو اپنے باپ کے نقش قدم پر رنگوں اور برش کی مدد سے تصویر بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بہت غمزہ اور اداس ہے۔" بھائی نے جواب دیا۔ "تمہارا کیا اندازہ تھا؟"

میں نے اپنا سر فٹنی میں ہلایا، لیکن مجھے یاد آیا کہ میں تو پردے کے پیچھے تھی اور بھائی مجھے دیکھنے سے قاصر تھا۔ "میرا خیال تھا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ سب کچھ بھول جائے گی۔"

"کیسے ہو سکتا ہے؟" بھائی نے کہا۔ "ہماری دنیا میں یوشی لیوٹی کو آئے برسوں بیت چکے ہیں مگر اس دنیا سے باہر کی اصل دنیا میں اس کی تم شہر کی گونچا چند روز ہوئے ہیں۔"

میرے ہاتھ سے چھوٹی سی سفید گیند گرنی اور فرش پر لوتھکتی چلی گئی۔ "یہ کیسے ممکن ہے؟" میں نے استعجاباً

آوی کی موجودگی کا کیا جواز ہو سکتا تھا! جب میں دوبارہ عورت کی جون میں آئی تو مجھ پر ایک انکشاف ہوا۔

☆ ☆ ☆

جب میں نے ماں کو بتایا تو وہ خوشی سے جھج اٹھی: "کیا کہا؟ تم ماں بننے والی ہو؟"

"میں نے تو یہی محسوس کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "جب میں نے دوبارہ عورت کا روپ دھارا تو مجھے یہ محسوس ہوا۔ میں یہ بھی محسوس کر رہی ہوں کہ یہ بیٹا ہے۔"

"اوہ! بیٹا! کتنی اچھی خبر ہے۔ تم اس گھر کے لئے کتنی بڑی خوشی لائے والی ہو۔"

"لیکن ماں۔" میں نے قدرے پریشان ہو کر کہا۔ "یہ کیسے ہوگا؟ میں روپاہ ہوں۔ میرا بچہ بھی روپاہ ہوگا۔ یوشی لیوٹی جب یہ دیکھے گا تو مجھے چھوڑ کر چلا جائے گا۔"

ماں میری کم عقلی پر ہنس دینی۔ "تم عورت بنی ہو۔ تمہاری شادی ایک آدم زاد کے ساتھ ہوئی ہے۔ تمہارا بچہ ایک انسان ہوگا۔ تمہارا شوہر دیکھے گا تو بہت خوش ہوگا۔ میں یہ فرض خیری تمہارے دادا کو سنائی ہوں۔"

ماں نے بیٹا کا تھا دیا دیا۔ یوشی لیوٹی نے سنا تو خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔

وقت گزرتا گیا۔ رفتہ رفتہ میرا وزن بڑھتا گیا۔ مجھے چلنے پھرنے میں دشواری محسوس ہونے لگی۔ اگرچہ میرے شوہر کو اپنی ڈے داریوں کے سلسلے میں گھر سے باہر رہنا پڑتا تھا، لیکن اسے جو بھی لمحہ میرا آدھ میرے ساتھ گزارنے کی کوشش کرتا، پھر بھی میں پور ہونے لگی۔ ایسے وقت میں دادا کی دی ہوئی گیند نکال کر اس کے ساتھ کھیلنے لگ جاتی۔ میں اسے ہوا میں اچھال کر پکڑتی۔ جب کبھی یہ میری گرفت سے نکل جاتی تو میری خدا میں دودھ کر آتیں اور گیند اٹھا کر میرے حوالے کر دیتی۔

بچے کی پیدائش بڑی آسانی سے ہو گئی، حالانکہ باعوم ایسا نہیں ہوتا۔ جیسے ہی ماں نے اسے کمرے میں داخل ہونے کی اجازت دی، یوشی لیوٹی دوڑتا ہوا سیدھا میرے پاس آیا۔

حالانکہ یہ موسم گرما تھا اور رات جب رہی تھی۔ بہت سے کمروں کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ مکان کی روشنی میں میں نے پرندوں کو دیکھا جو دیوانہ وار شعلوں میں جل رہے تھے۔

شکل سمت کے کمروں میں، جہاں شکبہ کا کمرہ تھا، روشنی مدھم تھی۔ میں دسپے قدموں پر آدے کے قریب کھٹک آئی اور اندر جھانکے لگی۔ شکبہ غم زدہ اور اداس بیٹھی تھی جب کہ ایک بھگتہ سر جھکائے کچھ پڑھنے میں مصروف تھا۔ گھر کے نمایاں کمرے روشنی میں نہائے ہوئے تھے۔ میرے شوہر کا دودھ سرا بیٹا بڑی عمر کے چند

آویوں کے ساتھ کھڑا کھنگو کر رہا تھا۔ بڑی عمر کے وہ آوی سڑی کپڑوں میں تھے۔ وہ شکبہ کے بھائی لگتے تھے۔ وہ درخت کا ایک ٹکڑا کر لائے تھے جو آوی کے قد جتنا تھا۔ سب اس سے کے گرد جمع تھے۔ ان کے ساتھ ایک بھگتہ بھی تھا۔ سبھی نے عجیب و غریب قسم کے لباس پہن رکھے تھے۔ شاید یہ ان کی لباس تھے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اس گھر میں کوئی حرکت تو نہیں ہوئی تھی، پھر ہاتھ

کھینچا؟ پھر مجھے خیال آیا شاید یہ لوگ میرے شوہر کا سوگ منا رہے ہیں۔ اس خیال پر مجھے ہنسی بھی آئی، لیکن پھر میرے سینے میں درد کی ایک لہری اٹھی اور میں آزدرد ہو گئی۔

لڑکے نے ایک ٹیچھی اور ہتھوڑی کی مدد سے تے کو کاٹنا شروع کر دیا۔

"یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟" میرے بھائی نے سرگوشی کی۔ "کیسے بے قرینہ لوگ ہیں یہ؟"

"پتہ نہیں کیا کر رہے ہیں لیکن مجھے یہی ہے سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔" میں نے جواب دیا۔ "اوہ! قریب آجاؤ۔ دیکھتے ہیں یہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔"

"میرا بھائی بیٹ کے بل آگے رہ گیا۔ میں نے اس کی ہتھوڑی کی۔ خاصی دیر تک لڑکے یہ عمل دہرا تا رہا۔ لڑکے نے جھنجھٹی اور ہتھوڑی بالا کر شکبہ کے بھائی کو دے دی۔

"ختم؟" آوی نے پوچھا۔ میں نے اور آگے ہو کر تے کو غور سے دیکھا۔ اس پر کندہ کاری سے کوئی شبہ نہائی گئی تھی، لیکن پتہ نہیں

جل رہا تھا کہ کس کی شبیہ ہے۔ بخشو آگے بڑھا۔ اس کے دو معاونین نے آئینہ ان میں لوہان ڈالا۔ پھر بھی پیٹ کے بل لیٹ گئے اور آہستہ آہستہ بدبانے لگے۔ بخشو ان سے آگے لیٹ گیا اور اونچی آواز میں بھجن پڑنے لگا۔

وہ گیارہ سرون والے دیوانوں سے مدد طلب کر رہا تھا۔ اس بار میں نے اور آگے ہو کر غور کیا تو کٹوری کے سچے پر گیارہ سر بازوؤں اور ٹانگوں والی شبیہ مجھے نظر آئی۔ جب اس نے دیوان کو پکارا تو میرے کندھوں کے بال کھڑے ہو گئے۔

”مجھے اس سب سے نفرت ہے۔“ میں نے اپنے بھائی سے سرگوشی میں کہا، لیکن اس نے میری طرف رخ کر کے دوبارہ توجہ انہی کی طرف مبذول کر لی۔

بخشو اپنے دیوانے سے بار بار ایک ہی اٹھارہ ہاتھاکہ پوشی نیوٹی کی نقش کماں ہے۔ اس کی وہاں تک رہنمائی کی جائے۔ اس کے چیلے آئینہ ان میں بار بار لوہان ڈال رہے تھے جس کا دواغواں سرفروں کی شکل میں فضا میں پلہ ہو رہا تھا۔ بخشو کی التجائیں سن کر مجھے وحشت ہونے لگی۔ میرا دم گھٹنے لگا اور وہاں رکنا محال ہو گیا۔ میں بھاگ کر اسٹور روم کے فرش تک آئی۔ جلدی جلدی میں نے عورت کا روپ اختیار کیا۔ میرا جسم کانپ رہا تھا۔ ”پوشی! پوشی! کماں ہو تم؟“ میں عمل کے ٹکروں میں دوڑتے ہوئے بے تماشاً چلتی گئی۔ مجھے یہ بھی خیال نہ رہا کہ نوکر کیا سوچیں گے۔ میں شوہر کو آواز میں دیتی دہرانہ دار کڑوں کے پکڑ گانے لگی۔ اچانک ایک کمرے سے پوشی نیوٹی گھبرائے ہوئے اندر میں باہر نکلا۔

”بیوی!“ اس نے میری حالت دیکھ کر قد رے غصے سے کہا۔ ”کیا بات ہے؟ کیوں اس طرح رہی ہو؟ میرے سران تپتے ہوئے ہیں“ ان تک بھی تسماری جی پکار جا رہی ہے۔

”پوشی!“ میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے۔۔۔ لیکن مجھے ڈر لگ رہا ہے۔۔۔ دوسرے۔۔۔ دوسرے۔۔۔“

اس کا چہرہ نرم پڑ گیا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور مجھے قہم لیا۔ ”کیا بات ہے؟ بچے کو کچھ نہیں ہو گیا؟“ میں نے اپنی سانسیں استوار کرنے کی کوشش کرتے

ہوئے کہا: ”نہیں“ بچے کو کچھ نہیں ہوا۔ میں کیا ہاؤں؟ وہ دھویں کا سرفروں اور وہ تسماری تلاش میں نکلا ہے۔ شاید میں نے کوئی خواب دیکھا ہے۔ میں جاگ پڑی۔ میں بالکل تھکا ہوا تھا۔ ”مجھے بہت ڈر لگا۔“

”تم تمہارا تسماری خادماں کماں ہیں؟“ وہ وہاں ہیں۔ میرا مطلب تھا۔۔۔ میں نے خود کو اس کی باہوں میں گرا دیا اور سسکیاں لینے لگی۔ وہ مجھے تسلیاں دینے لگا۔ اس نے ایک خادمہ کو اشارہ کیا کہ مجھے سنبھالے۔ خادمہ نے آگے بڑھ کر مجھے دونوں شانوں سے قہم لیا تو پوشی نیوٹی نے کہا: ”گھبراؤ مت! میں مسافروں کو رخصت کر کے ابھی آتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے غصہ حال ہو کر کہا۔ ”جلدی آنا۔“

میں اپنے کمرے میں پوشی نیوٹی کا انتظار کرتی رہی۔ میں اندر میرے میں بیٹھی تھی۔ میرے ہاتھ میں وہی سفید گیند تھی جو میرے دادا نے مجھے دی تھی۔ میں بے خیالی میں گیند ہوا میں اچھا تھی اور پکڑتی۔ مجھے وہ رد کردھویں کے اس سرفروں کا خیال ستا رہا تھا جو یقیناً میرے شوہر کی تلاش میں نکلا تھا۔ میرا دماغ دوسرے کمرے میں سو رہا تھا لیکن ایک خادمہ اسے میرے پاس لے آئی۔ اسے دیکھ کر میری دھماکے بند ہو گئی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا: ”میرا شوہر مجھ سے محبت کرتا ہے۔ یہ بیٹا اس محبت کی شادست ہے۔ کوئی بخشو نہ اسے چھین سکتا ہے اور نہ میری محبت کو۔“ میں انتظار کرتی رہی لیکن پوشی نیوٹی نہ آیا۔ اس کے بجائے گیارہ سرون والا دیوانا آ گیا۔

وہ ایک بوڑھا بخشو تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھری تھی۔ اس کا سر اگرچہ ایک ہی تھا، لیکن مجھے یقین تھا کہ یہی گیارہ سرون والا دیوانہ ہے کیونکہ ہمارے عمل کی ہر چیز جادو سے بنی ہوئی تھی سوائے اس بوڑھے کے۔ اس کے جسم سے لوہان کی بو آ رہی تھی۔ دیوانے کے سوا کوئی ہو سکتا تھا؟ وہ عمل کے جن میں گئے درختوں کے درمیان سے غلط انداز میں قدم اٹھاتا آگے بڑھا۔ جہاں جہاں سے وہ آگے بڑھ رہا تھا اس کے عقب میں وہ چرس غائب ہو رہی تھی جو ہم نے جادو سے بنا رکھی تھی۔ درخت، پھول، آرائشی پودے، خوبصورت

روشنی سب غائب ہوتی جا رہی تھیں۔ جہاں جہاں اس کا قدم پڑتا، جادو کا اثر داخل ہوتا جاتا۔ وہ سیدھا ہمارے عمل کے دروازے کی جانب آ رہا تھا۔

”نہیں!“ میں چیخ اٹھی اور برآمدے کی جانب بھاگی۔ ”رک جاؤ۔“ میں پوری قوت سے چلائی۔ اس نے مجھے میری چیخ سن لی تھی۔ وہ آگے بڑھا چلا گیا۔ میں اس کمرے کی جانب بھاگی جہاں میرا شوہر مسافروں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ”پوشی! بھاگو! جلدی کرو۔“ میں حلق پھاڑ کر چیخی۔

”بیوی؟“ پوشی نیوٹی کمرے سے باہر نکل آیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے عقب میں بنا برآمدہ کا پنا اور نفا میں تحلیل ہو گیا۔ میں گھٹنوں کے بل گر پڑی۔ بوڑھا بخشو میرے قریب سے گزرا تو میں نے سختی کے ساتھ اس کے پیچے کو پکڑ لیا۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کی گھواری جبین میں پھنسا لیا، لیکن وہ رکا نہیں اور آگے بڑھا گیا۔ میں اس کے ساتھ گھس رہی تھی۔

”کون ہو تم؟“ میرے شوہر نے گرج کر کہا۔ بوڑھا ۔۔۔ اس کی طرف بڑھا تو پوشی نیوٹی نے چند قدم پیچھے ہٹ کر اپنی گھواری نکال لی۔ میرے حلق سے ایک چیخ اٹھی۔ میں نے دیکھا کہ پوشی نیوٹی کی گھواری نفا میں تحلیل ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں اب چند گتے تھے۔ میرے شوہر نے پریشانی سے اپنے ہاتھ کے ٹکوں کو دیکھا اور پھنکار کر زمین پر پھینک دیا۔ بوڑھے بخشو نے اپنی چھری پوشی نیوٹی کے پیٹ میں چھوئی تو وہ اٹنے قدموں اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔

”چھوڑ دو اسے! خدا کے لیے اسے چھوڑ دو۔ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔۔۔“ میری چیخیں نکل گئیں۔ میں نہیں اور التجائیں کرتی رہی، لیکن میری آواز کا اور فریادوں کا بوڑھے بخشو پر کوئی اثر نہ ہوا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ گھس رہی تھی۔ میرا ہاتھ اس کی جبین میں پھنسا ہوا تھا۔ چڑے کی سخت جبین میرے نرم ہاتھک ہاتھ میں کھب گئی تھی۔ میرا ہاتھ لوہان ہو رہا تھا۔ اگر میرے ارد گرد کچھ بھی حقیقی نہ تھا تو میرے ہاتھ سے بتا ہوا گرم گرم خون ضرور حقیقی تھا۔ پوشی نیوٹی میری حالت پر سخت مضطرب تھا اور میری مدد کے لیے آگے

بڑھنے کی اس نے کوشش بھی کی، لیکن بخشو اپنی چھری اس کے پیٹ میں چھوئے اسے مسلسل پیچھے گھمائی جانب دھکیل رہا تھا۔

چڑے کی جبین میرے خون سے تھرتھاتی اور میرا ہاتھ پھسل گیا۔ میں پیچھے گر پڑی۔ بخشو آگے بڑھ گیا۔ اس نے میرے شوہر کے پیٹ میں زور سے چھری چھو کر اسے دھکیلا تو وہ میرے جادوئی عمل سے باہر نکل گیا۔ اب وہ اپنے کمرے کے کچن گارڈن میں کھڑا تھا۔ میں گھسیتی ہوئی اس کے پیچھے لگی، لیکن مجھے علم تھا کہ اب نہ تاخیر ہو سکتی ہے۔ میں زمین پر پڑی تھی۔ میرے ہاتھ خون آلود تھے جبکہ لمبے سیاہ ریشمی بال خاک آلود تھے۔

پوشی نیوٹی کے سامنے اس کا حقیقی گھر تھا اور حقیقی ماحول، شام کا دھندلا پھیل رہا تھا۔ تیرہویں شام پوشی نیوٹی پھر سے اپنے کمرے میں کھڑا تھا جبکہ میرے ساتھ وہ تیرہ برس گزار کے گیا تھا۔ کمرے کے سبھی ملازم اور دیگر لوگ باغ میں کھڑے آہیں میں چہ بیگنیاں کر رہے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے پوشی نیوٹی کے دو ٹکس لہرا رہے تھے جیسے پانی میں کوئی چیز جھللائے اور غائب ہو جائے۔ ایک ٹکس میں وہ اپنے خوبصورت لباس میں تھا جو ذرا گرد آلود ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خالی نیام تھی۔ دوسرے ٹکس میں وہ بیٹلے اور گندے کپڑوں میں تھا۔ اس کی گرد آلود شکل پہچانی نہیں جاتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کچھ سے تھرتھاتی ایک چھری تھی۔ یہ ایک ایسے آدمی کا ٹکس تھا جو لومڑیوں کے ساتھ مٹی میں رہا تھا۔

سب سے پہلے لڑکے نے میرے شوہر کو دیکھا اور چیخا ہوا دوا: ”ابو؟ کیا یہ آپ ہیں؟“

”بیٹا؟“ میرے شوہر نے جھپکاتے ہوئے کہا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی یادداشت واپس آ رہی ہے لیکن جادو کا اثر ابھی پوری طرح داخل نہیں ہوا تھا۔ ”یہ تم ابھی تک استے ہی ہو! میرے بعد بڑے کیوں نہیں ہوئے؟“

لڑکے نے اپنے بازو پوشی نیوٹی کی کمرے کے گرد لپٹا لیے: ”اوہ ابو! آپ کہاں چلے گئے تھے؟ آپ تو بوڑھے نظر آ رہے ہیں۔“ پوشی نیوٹی نے لڑکے کو پیچھے دھکیل دیا: ”میں صرف

کی۔ اگر وہ اب بھی مجھے یاد کرتا ہوا تو وہ گیند کو دیکھ لے گا اور مجھے تلاش کرے گا پھر ہم اپنی مرضی سے انسان یا مرد یا کسی ایک روپ میں زندگی گزاریں گے نہ کوئی جادو ہوگا اور نہ جھوٹی زندگی۔ اگر وہ شکوہ اور اپنے بیٹے کے ساتھ خوش ہوا تو وہ گیند کو بھی برف کا ایک ٹکڑا ہی سمجھے گا۔

آخر کار انتظار کی گزریاں ختم ہوئیں اور چاندنی رات آگئی۔ برف روٹی کے گالوں کی طرح گر رہی تھی۔ ایسا دل فریب منظر تھا کہ میں ہسوت ہو گئی۔ میں بید بچوں کے درخت تلے سفید گیند لے کر کھڑی تھی۔ پوٹی ٹیوٹی حسب عادت گھر سے نکلا اور جن میں آیا۔ وہ ایک ٹکٹ چاند کو دیکھ رہا تھا پھر وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ میں نے اپنی سائیں روک لیں اور گیند اس کے آگے لڑھکا دی۔

پھر جانتے ہیں کیا ہوا؟

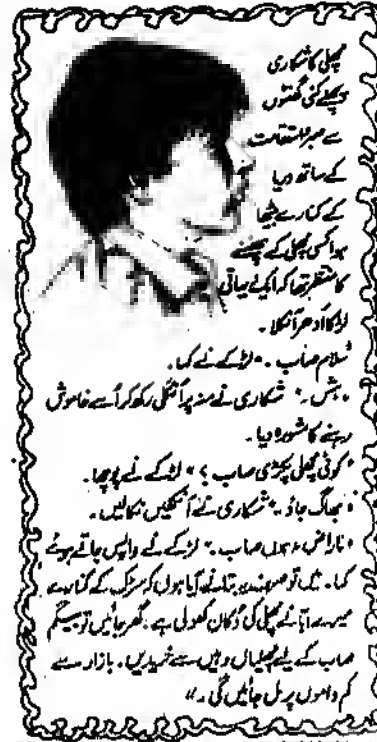
کچھ بھی نہ ہوا سوائے اس کے کہ فیرنی آہو ڈاری نے عرش بھی ہلا دیا لیکن پوٹی ٹیوٹی بے نیازی سے آگے بڑھ گیا۔ وہ اپنی دنیا میں واپس چلا گیا تھا۔ میرا جادو اسے روک نہ سکا نہ میری محبت!



اگلے ہوں لیکن مجھے عجیب سے خدشات گھیرے رہے۔ پوٹی ٹیوٹی کی روز تک دو تار پہ جب میں رات کو چھپ کر ان کے گھر کی سن گن لیتی تو مجھے اس کی سسکیاں سنائی دیتی۔ میں اس کا نام لے کر آوازیں دیتی اپنے بیٹے کا نام لیتی۔ گھر والوں نے کئی بار ہتھکڑیاں جو آکر مجھ پر پڑنے اور ان سے کہنے کہ جادو کی تاثیر بہت قوی ہے "آہستہ آہستہ زائل ہوگی۔"

ماں بھائی دادا اور بیٹے کے پیچھے مجھے اس گھر سے رخت ہونے لگی۔ پوٹی ٹیوٹی ہی ٹھیکل ہو گئے تھے۔ کمرے بھی ایک ایک کمرے کے ٹھیکل ہو رہے تھے۔ کبھی میں سوچتی کہ انسانی روپ ترک کر کے اپنی دنیا میں لوٹ جاؤں لیکن یہ اتنا بھی آسان نہ تھا۔ میں اب صرف ایک لومڑی نہیں تھی اور نہ ہی میں صرف ایک عورت تھی۔

اس موسم گرما اسی طرح گزر گیا۔ سردی کا زمانہ آیا۔ میں اب بھی پوٹی ٹیوٹی اور اپنے گھر والوں کی ہنسنے والی ہر ہرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ برف باری میں چاندنی رات کو پوٹی ٹیوٹی جن میں ضرور شلہا کرتا تھا۔ وہ چاندنی اور برف پر ٹھیکیں لگتا تھا۔ میں نے منصوبہ بنایا کہ اب کے چاندنی رات کی برف باری میں جب وہ چہن میں لٹکے گا تو میں اپنی سفید گیند اس کے آگے لڑھکا دوں



بھاگ اٹھا۔ میری ماں، میرا بھائی، دادا اور میرا پٹا جو ابھی اتنا بڑا نہیں ہوا تھا۔ میں بھی دوبارہ کے روپ میں بھاگی۔ میں زخمی بھی تھی۔ جانے کب اور کہاں ہے وہ شہر ہو کر گر کر پڑی۔

مجھے کچھ یاد نہیں کہ کتنے دن گزرے جب میں نے دوبارہ عورت کا روپ دھارا اور اپنے گھر لوٹ آئی۔ وہی طلسمی گھرا یہ گھرا اب خالی تھا۔ غار بائیں بھی نہ تھیں نہ میرے لیے اچھے اچھے کھانے اور نہیں کپڑے لائی تھیں۔ میں انتظار کرتی رہی لیکن میرے گھر والے لوٹ کر نہ آئے۔ میرا دادا بوڑھا تھا شاید وہ اس تعاقب کی تاب نہ لاسکا ہو۔ میری ماں، میرا بھائی اور میرا پٹا ان میں سے کوئی بھی لوٹ کر نہ آیا۔ میں دعا نہیں کرتی کہ وہ

تمہاری ماں کو اس کے سیکے واپس بھیجے آیا ہوں۔ میرا خیال ہے وہ لوٹ آئی ہے تمہاری ماں نے سیکے جاکر مجھے کتا بائیں کیا تھا لیکن مجھے کوئی اور مل گیا ہے۔ سختی شاندار طاقت ہے وہ! میں نے اس سے شادی کر لی اور میرا اس سے ایک بیٹا بھی ہے۔ وہ تم سے زیادہ خوبصورت اور محنت مند ہے۔ وہی میری چاندی اور وارث ہے۔ میں اس کی ماں سے بھی بے حد محبت کرتا ہوں۔"

لوگ نے پریشان ہو کر برآمدے کی جانب دیکھا۔ میری نظریں بھی ادھر اٹھ گئیں۔ وہاں شکوہ کھڑی تھی۔

"کہاں ہے تمہارا وہ بیٹا؟" لوگ نے پوچھا۔ "کیوں؟ وہ وہاں ہے۔" میرے شوہر نے استور روم کی جانب اشارہ کیا۔

مجھے استور روم کی طرف دیکھنے کے تو انہیں میں نظر آئی۔

"لومڑی! ایک آدمی چٹا اور پھر بھی چلتا ہے۔" "لومڑی! لومڑی! کچھ لوگ ڈنڈے اٹھ کر میری طرف بھاگے۔

"پوٹی ٹیوٹی! انہیں روک۔" میں نے فریاد کیا۔ پوٹی ٹیوٹی جھجکا۔ وہ حذب ب تھا۔ "یہی" اس نے متزلزل انداز سے کہا۔

"لومڑی! لوگ چلتے۔" خدا کے لیے میرے پاس قوت۔ میں نے پوٹی ٹیوٹی کے لیے اپنی بائیں پھیلا دیں۔ وہ میری طرف بھاگا۔ لوگ نے خود کو اس کے بازوؤں میں نہ لگا دیا۔ اس کا توازن بگڑ گیا۔

میں نے ایک بار پھر برآمدے کی جانب دیکھا وہاں مجھے شکوہ کھڑی نظر آئی۔ اس کی آنکھیں... وہ وہاں رہے تھے۔ میں جان گئی کہ پوٹی ٹیوٹی نے طاقت صرف اسے میں عورت کے روپ میں نظر آئی تھی۔

انہوں نے ہمارا سر گرم تعاقب کیا۔ نور ہمارے ڈنڈے اٹھا کر بھاگے۔ استور روم کے فرش تلے انہوں نے ڈنڈے گھسے۔ ہمارا خاندان مختلف متوں میں

برفانی بحیرہ

ڈیوڈ کیسن



پاؤں کے نشان، دیکھ پلٹے گئے تھے جن میں پانی بھرا ہوا تھا۔
 اٹکی، ہتھالی میں وہ آگے بڑھا اور دیر سرکشوں میں آہستہ آہستہ کی
 ایک گھڑی رکھائی وہی قریب ہی ایک نشان پاؤں کا بھرا ہوا تھا۔ رات تھی
 ختم ہو چکی تھی، اس میں جراب اتھی، سرگرم تاروں، وہ کچھ پریشان سا بگایا پسند
 کوں بندھی ہو، اس کی گرفت مضبوط ہو گئی اور وہ ایک عزم کے ساتھ آگے
 بڑھا، جلدی نہ دیا، ایک سبب کے پاس پہنچ گیا، تاکہ ایک بانہہ اس کی طرف پھیلا
 رہا تھا اور دوسرا کڑی لپٹا ہوا تھا، جو ٹوٹنے پر تھکے ہوئے تھے اور کٹ

سراغزبان سپر ٹیڈنٹ جسٹس نیل باربیٹا، میٹروپولیٹن راجھا
 "آپا، جہان آ بیل کے گا۔
 "کیسے مزاج کرے، مہن؟
 "تجس کا اندہ ہوگا۔
 "خاصی مدت سے نظر نہیں آئے۔
 "فرست ہی نہیں ملے، مجھے آپ کی پڑسکون نہ ملے، پر دسک کا ہے۔
 "آپ کو دیکر کمرست ہوئی۔ وہ نہانی کے گا۔
 "درہیت آپ ہی سے ملے، کیا ہوگا، مرافعال قاضی ہیں۔

اور حکومت کر رہی تھیں۔ ویدیا بالی کی سب سے بڑی سہارا بن گئی۔ اس کا جائزہ لیا گیا اور اس نے اپنے باپ کا مکمل شکریہ ادا کر کے اس کی طرف سے ایک بارزن نے قبضہ کر لیا۔
کے شانے میں سے اس کا اوردہ ملکان کی طرف چل پڑے۔
میرت ہے آپ نے فیض شمس ستر کر دی ہے ویدیا بالی کے گناہ۔
ہالی میرے اور میری شاغل زندگی میں نے ابھی ذمہ دہن کر کے ہیں
ایسا جان، اب اس کا آئندہ سال بہتری امریکہ کی سیاست کے تسلیم سے ہو گا۔
یہ آپ کو اس سے مل چکی ہے؟
جی نہیں۔ اب فیض شمس نے اپنی جگہ چھوڑ دی ہے۔

اب وہ مکان کے اندر کوٹ بٹے کرے میں پہنچ گئے تھے یہاں
شکار ٹھہرے تھے آگ وہ کبھی جیتی جاتی تھی آرام کریاں اس کی
دوشی میں چمک رہی تھیں وہ آگ کے قریب پہنچ گئے وہاں سے ان کے
پہلو ڈھل گیا تھا اس کے سامنے یہ صحرانگ بندی کی کوٹ ہی
گولی سے ڈھیر کیا تھا وہ کوٹ کس نے یہ دیکھا تھا اس کو کیا سانس
فرشتے سے فرشتہ اُڑا تھا۔
کیا جیسے گا، ہاؤس نے پہنچا۔

مکان ہر جہاں ہے
جو کائنات آئینہ ہے
تیرا دستِ حق ایک مجلسِ کرم ہے
اس کے اہلِ ہجر اس کے اہلِ ہجر ہے
تیرے اہلِ کرم تیرے اہلِ کرم ہے
ایک شاہِ عالم کی شاہی ہے

ہکا لالہ و باطن سے کہا
 آدمی نے کہا ہاں میری اہل و عیال
 میرا کچھ مال ہے ہاں میں نے کہا
 ہاں تو کہیں کو کہیں میں نے کہا

میں نے اچھے غلاموں میں سے دو کو اپنی خدمت میں لگا کر ان سے بہت محبت کی تھی۔ لیکن غلاموں نے ان سے نہیں لگاؤ کیا۔ ان کے دل میں کام کرنے کا خواہش نہ تھی۔ اس لیے ان کو لگا کر ان سے بچ کر ان کی خدمت میں قریب آئے۔

جس ایک پریشان ہے۔ اس کے لئے سنا ہو گا کہ گزشتہ سات اسی نے پھر
 قابل نہیں کیا انہی کی ایک کتبہ : کہہ رہی تھیں کہ ہے ؟
 فرصت

فوت چہاں۔ وہ بڑی اسیاں کے ساتھ بڑی چٹانوں اور درختوں سے
ہٹ کر لہریں جتا جتا چلا رہا۔ کبھی اوپر چٹان کی طرف بڑھتا اور کبھی
نیچے ندی کی طرف آجاتا۔

اور پھر وہ لگ گیا۔ یہیں قریب ہی سینڈل کی لاش ملی تھی۔ یہ ایک
پڑھنوں کا تھا۔ تھوڑے عرصے پہلے ہی وہی تھا۔ چاند باروں کی وارث
میں چھپ رہا تھا۔ تھوڑے دم کے لئے کہ وہ چٹان کی طرف بڑھا تو وہیں میں
سرک پر پڑنے والی سبز لاش کا شہر آئی۔ اوپر چڑھا تو اوپر چٹانیں
وہاں دیکھیں۔ وہ بڑی چٹانوں کے گرد دائرہ بنا کر بیٹھے تھے۔ وہ جانتا تھا اس
کا شکار اس پر عمل کرنے کے لئے وہ اس کے پاس پہنچے گا۔ تاہم لذیث
کے کوئی بات نہ تھی۔ جس چنگڑ کا فاصلہ چاہیے تھا کہ وہ اپنی بندوبست
چھوڑ سکے۔ چٹانوں کے کئی کئی کھنڈے تھے کہ وہ وہاں تک لگ گیا۔ اس نے
چاندوں کی طرف نظر ڈالی۔ اور شاہراہ پر دوڑتی ہوئی لاکھوں روشنیوں کی نظر
آئی۔ سارا علاقہ ایک سیاہی کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ شاید وہ چیزیں ہیں
اس کی منتظر ہیں۔ اس آئینہ پر دیدار ہلکا ہوا مگر وہ کبھی نہیں دیکھا۔
”خدا یہ اس سے مجھے دکھائیں۔“

شراب خانے کے گھڑوؤں کا ایک بھرہ ایک ایک بٹاؤں اور
بروس ہوتے تھے۔ بروسی ہاتھی چوڑے شخص تھا۔ آئینے کا کچھ لکڑی
پر دوڑتی تھی۔ اس نے کھانا کھا کر باقی رہا اور شراب خانہ لے لیا
رہتے پر بنایا جس پر بہت کم کھدوشت تھی۔ یہ بائرن کے مکان اور
چھوٹے لڑکے کے درمیان واقع تھا۔ اس شراب خانے میں جو لوگ آتا
تھے ان میں ایک دروازہ ایک ہی تھا۔ وہ اپنی نئی دکان
کے ساتھ ہی تھا۔ ہمارے علاقے کی ایک عورتیں میں رہتا تھا جو شراب خانے سے
نوشٹ کی ساقف پر تھی۔ ایک ہیٹھ پھیل جاتا۔ وہ نہ نکل گیا مگر
اس آئینے کے کھانے کے کھانے تھا۔ یہی وہی سلاہ زنگ کی شریف تھی
میں جو کھانے کی گھڑی ہوتی تھی۔ وہی وہی کھانے کی گھڑی ہوتی تھی۔ وہی وہی
فرمانت میں لگتے۔ ایک عورت مسرتی کہ آقا کچھ مسرتی تھا۔ وہی وہی
دقت شادمانہ دھن کے گائی تھیں۔ یہی وہی تھی۔ ایک ایک ہفتے میں چار
پاکہ ادا کرتے کہ دقت شادمانہ شراب خانے میں جا کھاتا۔ وہی وہی
کی کہ عورتیں چلتے تھیں۔ یہی وہی تھی۔ ایک ایک ہفتے میں چار
اداکار تھے۔ وہی وہی تھی۔ ایک ایک ہفتے میں چار

ایک نے چٹان دکھا اور کھانا کھا۔ وہی وہی تھی۔ ایک ایک ہفتے میں چار
ایک ایک ہفتے میں چار

رنگوں سے آلودہ تھے۔ چٹان پر بڑی ہاون کی لٹ اس نے پیچھے ہٹ
تو آتے ہی رنگ لگ گیا۔ یہی وہی تھی۔ ایک ایک ہفتے میں چار
میں مصروف تھی۔

میرا خیال ہے کہ وہ آلودہ گھنے کے لیے بروسی کے اہل بڑاؤں کی
نے کہا۔

میرا خیال ہے کہ وہ آلودہ گھنے کے لیے بروسی کے اہل بڑاؤں کی
میں آئیں یہاں تھا۔ اس کا تعلق کروں گی۔ وہ کروں گی اور اس کی لکھیں
پھر کتاب پر دوڑنے لگیں۔

ایک نے بیکت پتہ، اولیٰ کو بھنگے سے پھینکا اور باہر نکل گیا۔
وہ وارہ بندہ ہوتے ہی چٹان کے آواز آئی۔ اس نے آواز دہرائی کہ اس نے
کی ضرورت ہی نہ تھی۔ یوں ہی اس کی آواز کا ڈنکا دھنکا اس کے پاس
کوئی تھی۔ چٹان پر چڑھ کر وہی وہی تھی۔ ایک ایک ہفتے میں چار

ایک تیزی سے چلا ہوا تھا۔ اس نے شراب خانے کے گرد و شاہان کی
اور بائیں جانب کسی تھوڑے دور باڑن کے مکان کی کھانے پکانے سے اس کی
کبھی صاحب سلامت نہ ہوئی۔ اس نے ایک شراب خانے میں داخل ہوا۔ تو
وہاں کوئی ایک ایک تھا۔ وہی وہی تھی۔ ایک ایک ہفتے میں چار
وہی وہی تھی۔ ایک ایک ہفتے میں چار

میرا خیال تھا اس قاتل کی ہر گاہ میں تمہارے رشتہ ہر نہیں
کھلو گے۔ بروسی کے کہا۔

قاتل؟ ایک نے غصے سے کہتے ہوئے پوچھا۔
تم نے؟ اجازت میں دیکھا۔
میں، اجازت میں دیکھا۔

میں، اجازت میں دیکھا۔
میں، اجازت میں دیکھا۔
میں، اجازت میں دیکھا۔

میں، اجازت میں دیکھا۔
میں، اجازت میں دیکھا۔
میں، اجازت میں دیکھا۔

کوئی نہ تھا۔
میں، اجازت میں دیکھا۔
میں، اجازت میں دیکھا۔

ایک نے کوئی نہ تھا۔
میں، اجازت میں دیکھا۔
میں، اجازت میں دیکھا۔

میں، اجازت میں دیکھا۔
میں، اجازت میں دیکھا۔
میں، اجازت میں دیکھا۔

میں، اجازت میں دیکھا۔
میں، اجازت میں دیکھا۔
میں، اجازت میں دیکھا۔

میں، اجازت میں دیکھا۔
میں، اجازت میں دیکھا۔
میں، اجازت میں دیکھا۔

میں، اجازت میں دیکھا۔
میں، اجازت میں دیکھا۔
میں، اجازت میں دیکھا۔

لہا ہوا تھا۔ اس نے غصے سے دیکھا لیکن بروسی کی گردن غصہ نہ تھی۔ وہاں صرف
ایک شراب خانہ تھا۔

ایک تم جاگ رہی ہو۔ وہ پکارا۔ محمد خان نے فریاد کیا۔

وہاں میں غصہ نہ تھا۔ ایک لے لے کر ایک دھتک لگ رہا تھا۔
وہاں میں غصہ نہ تھا۔ ایک لے لے کر ایک دھتک لگ رہا تھا۔
وہاں میں غصہ نہ تھا۔ ایک لے لے کر ایک دھتک لگ رہا تھا۔

وہاں میں غصہ نہ تھا۔ ایک لے لے کر ایک دھتک لگ رہا تھا۔
وہاں میں غصہ نہ تھا۔ ایک لے لے کر ایک دھتک لگ رہا تھا۔
وہاں میں غصہ نہ تھا۔ ایک لے لے کر ایک دھتک لگ رہا تھا۔

وہاں میں غصہ نہ تھا۔ ایک لے لے کر ایک دھتک لگ رہا تھا۔
وہاں میں غصہ نہ تھا۔ ایک لے لے کر ایک دھتک لگ رہا تھا۔
وہاں میں غصہ نہ تھا۔ ایک لے لے کر ایک دھتک لگ رہا تھا۔

وہاں میں غصہ نہ تھا۔ ایک لے لے کر ایک دھتک لگ رہا تھا۔
وہاں میں غصہ نہ تھا۔ ایک لے لے کر ایک دھتک لگ رہا تھا۔
وہاں میں غصہ نہ تھا۔ ایک لے لے کر ایک دھتک لگ رہا تھا۔

وہاں میں غصہ نہ تھا۔ ایک لے لے کر ایک دھتک لگ رہا تھا۔
وہاں میں غصہ نہ تھا۔ ایک لے لے کر ایک دھتک لگ رہا تھا۔
وہاں میں غصہ نہ تھا۔ ایک لے لے کر ایک دھتک لگ رہا تھا۔

وہاں میں غصہ نہ تھا۔ ایک لے لے کر ایک دھتک لگ رہا تھا۔
وہاں میں غصہ نہ تھا۔ ایک لے لے کر ایک دھتک لگ رہا تھا۔
وہاں میں غصہ نہ تھا۔ ایک لے لے کر ایک دھتک لگ رہا تھا۔

وہاں میں غصہ نہ تھا۔ ایک لے لے کر ایک دھتک لگ رہا تھا۔
وہاں میں غصہ نہ تھا۔ ایک لے لے کر ایک دھتک لگ رہا تھا۔
وہاں میں غصہ نہ تھا۔ ایک لے لے کر ایک دھتک لگ رہا تھا۔

کچھ نہیں :-

کب تک گرفتاری میں آئے گی :- اس کے ایک ہمارے

نہت ایک تھی۔

تک :- کا سوال تو بعد میں پیدا ہو گا۔ ابھی تو ہمیں یہ معلوم نہیں کہ

پھر کو گرفتار کیا جائے :-

کیا میں اس بات کا ذکر کرتا ہوں :-

میںیں جھوٹے کہیں :- اور نہ ہمارے ساتھ آ سکتے ہیں۔ آپ

لوگ یہاں انتظار کریں۔ وہاں پر شاید کوئی کسے کی بات ہمارے پاس

ہو۔

ویدہ بانی اور بیل دونوں کو کھانا کھا رہے۔

اچانک ایک خیال رونے کے ذریعہ میں بھول کر طرح لڑا۔ اس کے

پھر سے کے تاثرات تبدیل ہو گئے۔ اس نے اپنی کمانی کو کھرا لنگ پیچے

کاٹھنڈو کر لیا۔

ایک نادر۔ مجھے ایک خیال نہ تھا ہے :- اس کے ہاتھ مارنے

ہوئے تو گرفتار سے کہا اور وہ آہستہ آہستہ شراب خانے کی طرف چل پڑا۔ اس

کا دل دور سے دھڑک رہا تھا۔ چاہے چند گھنٹوں میں یہ یقین کر لی ایک چم کھا

دیتے والی کمان ہو گی :- اس نے سوا اور جیسے تھوڑی ٹھکانوں سے دیکھا۔

شروع ہوتا ہے۔ جہاں زمین پر نشان لایاں تھے وہاں بھیچا نہیں کیا تھا۔

لو اس جگہ ضرور جونی چاہیے تھی :-

بیل کا خیال قاسم سلامت و جیدہ ہے۔

لیکن ایک جانور۔ یاد آئی۔ اپنی پر غم نہیں کر سکتا۔

یقیناً نہیں :- بیل نے کہا اور پھر جہاں اس نے واضح نشان بھی

پھوڑے ہوں :-

مگر ایک امکان اور بھی ہے :- ویدہ بانی نے کہا جب یہ فرق نہ لگوں

پر ملتی ہے۔ تو چار ناگوں پر دوڑنے والی مخلوق میں جی اس کی ہیئت

بدل جاتی ہے :-

ہاں یہ ممکن ہے :- بیل نے سرگوشی میں کہا۔

مزید نشان تلاش کرنے کی سرکوشش ناکام رہی۔ انہوں نے لڑا کو

مرکز بنا کر کوئی تین میل کا پیر لگا لگا۔ آہستہ آہستہ نوز سے دیکھتے ہوئے بیلانی

وقتاً فوقتاً زمین کا معائنہ کرتے کرک جاتا۔ وہ گھاس کھچھلا اور زمین کی

صحیح کا اندازہ کرنے کے لیے اپنی انگوٹھیں کاڑھتا۔ ان کے پاؤں کو کوئی

نشان زمین پر نہیں پڑا تھا۔ انہیں وہاں کوئی نشان ملا۔ اس واقعے

میں بیلان کا امکان بھی آتا تھا۔ آؤ وہ بیلانی مراد میں داخل آگئے۔

جہاں سے چلتے تھے۔ آسمان پر تاریکی چھائی تھی اور بیلان کا امکان تھا۔

کونٹ ایک بیل کے پاس کھل پڑی تھی۔ دونوں پیٹے میں مصروف تھے۔

وہ وارہ کھلا۔ دو ڈھرا۔ ویدہ بانی اور بیل شراب خانے میں داخل

ہوئے۔ تو بیلان کی پس پڑنے کے لیے آگے بڑھا۔

حضرات آپ اس نظر آئے ہیں :- اس نے پوچھا۔

ہاں۔ میں اس آواز میں :- بیل نے کہا۔

کوئی کہانی :- بیل نے پوچھا۔

مجھے ایک پانٹ شراب چاہیے :- بیل نے کہا۔

کوئی کامیابی نہیں :- آؤ کیا اس جانور کا کوئی نہیں ملا :- آپ

کوئی کچھ کرنا بھی ہو گا :- آپ اسے اس طرح آواز دے رہے ہیں اور لوگوں کو

قتل کرنے کی اجازت تو نہیں دے سکتے :- وہ نے اپنی زبک کا دھڑ

پر رکھ دی۔

آؤ سرخ لہجے میں جانے لگا :- بیل نے کہا۔

دل ہانے گا :- مستقبل کی بات کر رہے ہیں :- آپ دہشتیں جس کے

منطق کچھ نہیں کہا جاسکتا :- آپ اتنے بے گناہ :- اگر کوئی قتل کرنے کی چٹنی

دے رہے ہیں :-

کیا آپ کو احساس نہیں کہ پوچھنا بہت کچھ کر رہے ہیں :- اور نہ

پوچھا۔

خیر تھے ہیں :-

دوڑی ہی جی میں کھانا ڈال کر رہ گیا۔

آپ درست کہتے ہیں :- وہ اس نے کہا :- میں اس ہی وہ سے

خیر تھوں :-

بروس نے ویدہ بانی کو بارہا پیش کی۔ ویدہ بانی نے لہجہ گھٹ کر

دوسرا گھٹ لپائی تھا کہ بیلان اللہ اول ہو۔

میں نے بارہا کہہ دیا تھا :- اس نے کہا۔ اس کے ہاتھ میں جاری

پھری اور کوئی کوئی نہیں تھی۔ وہ ویدہ بانی کے پاس کھانا ہو گیا۔ بیل خود اس کا

کیا آپ یہاں قلیل کر رہے ہیں :- اس نے پوچھا۔

آپ نے گشت شب کا دفتر سن لیا ہو گا :- بیل نے سوال کیا۔

کوئی کوئی :- بیل نے پوچھا۔

ہاں۔ کچھ سرخ لہجے :- مگر اتنا نہیں کہ آگے بڑھا جائے :- ویدہ بانی

نے کہا۔

میںیں :- یہ شرم کی بات ہے۔ یہ انہیں تھا کہ آپ کی پرائی

ملاہٹ کو کراؤ کی ہو گی :-

کوئی بھی کوئی :- اس نے پوچھا۔

بیلان سکڑا۔ اس نے بیلان کے پاس بروس نے بیلان کر دی۔

آپ کو بھی ملائے عام ہے :- بیل نے کہا۔

بیلان نے دشکاری نہ کرنا چاہا۔

لیکن سنا ہے آپ چیدہ سے چیدہ کو کھانا کھاتے ہیں۔

کیا نہیں :- یہ آپ کے لیے ایک چیلنج ہے۔ ویدہ بانی کا کہنا ہے کوئی

شخص اس کو کھانا کھانے نہیں کر سکتا :- آپ کی لڑائی ہے :-

بلاشبہ وہ درست کہتے ہیں :- بیلان نے کہا اور سرکھانے لگا۔

سرخ بیلان :- کیا آپ ایک بے شکاری نہیں ہے :- بروس

نے پوچھا۔

حضرت میں شکاری ہوں :- آپ نے مٹی کا حریف قتل کیا ہے :-

کیا آپ قاتل کو دھڑلے کی کوشش نہیں کر سکتے :-

میں نے کوشش نہیں کی :-

بروس نے بیلان کی طرف دیکھا۔

حضرت :- مگر بروس سامی نیک نامی اور شہرت خودی کے ساتھ

چاہتی تو :- اس نے کہا۔

میں بیلان نے جاری دہ کرنے سے انکار کر دیا ہے :- میں نے اس

اصل مردوں کی کئی قصیدوں اور طلاق کے ٹپٹے چنے مقدسات کی خاطر

ایسویں صدی عیسوی کا پندرہواں سال اپنے پینے کی اثناء گمرانیوں میں زمانے کے ان بگڑت نشیب و فراز پر دستِ مفر
باندھ رہا تھا کہ ایک دہائی گھرے میں نہ بیتی تھی۔ تکیوں پر گھسوں والی گڑیا، گریس ڈارنگک نے تھم یا یہ تھم سا گھرا نا
موتوں سے براؤٹھسٹین کے سرسبز و شاداب جزیرے کے کنارے آباد تھا۔ وہیں ڈارنگک ایچی بونی کی پیدائش سے صرف چند ہفتے پہلے
وہاں کے لائٹ ہاؤس کا نگران مقرر ہوا تھا۔ اسی اداوس اور سنان مقام پر گریس بے وہاں جزمیں اور تین اس نے سندر کے افریب

کا داغ چکا جاتا، ہر نوع چاہے بھی ہوتا، گھوم پھر کر سیدھے
قدو جو رہے تندر ہواؤں اور تیز دھاروں کے بانے میں زیادہ
زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتی۔ آخر ایک دن
ڈارلنگ تنگ آکر چلا اٹھا:

”بھلا تمہیں ان باتوں سے کیا واسطہ؟ جب دیکھو بس
میں تندر ہواؤں اور طوفانوں اور چٹانوں کی ریت لگائے رکھتی ہو؟“
”آہا جان، میں کیا بتاؤں؟“ اس کا سر گریس خاموش ہو
گئی۔ اس کے سینے میں ایک ٹوک سی تھی۔ کاش وہ
دلا کا ہوتی، تو آج اس کی اسٹیکل پر کوئی انگلی نہ اٹھاتا، اسے
باپ نے نشی پھینکا تھا، لیکن ساتھ ہی تاکید کر دی
تھی کہ اس کا اولیں فرض گھر باپ کی دیکھ بھال اور گھر والوں
کی خدمت کرنا ہے۔

اب وہ سترو برس کی ہو چکی تھی اور اپنے باپ کے
چھوٹے موٹے لڑکھنوی سرکاری کاموں میں بھرتی ہونے لگا تھا۔
گلی تھی، اس سلسلے میں اسے بار بار لائٹ ہاؤس کی بل لکھائی
ہوئی ٹیڑھی پر چڑھنا پڑتا یہ سیر بھی اس کو سہ سے ملتی
تھی جس میں رات کے وقت جہازوں کو درست دکھانے کے
لیے ایک بہت بڑا لمپ روشن رہتا تھا۔

گریس جب ابچان تھی تو ان قیامت خیز طوفانوں سے
اس کا جی خوب بہتا تھا، لیکن اب ہوش سمجھانے کے بعد
وہ ان سے خوفزدہ ہی رہنے لگی۔ رات کے وقت جب کبھی
تیز رفتار ہواؤں کے چنگ سے اس کی آنکھ کھل جاتی وہ بھری
سافروں کی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگتی۔ سورج طلوع ہوتا
تو کھڑکی سے جھانک کر سندر کا نظارہ کرنے کی بہت نہ پڑتی۔
بس یہ خوف رہتا کہیں کسی تباہ شدہ جہاز کے ٹکڑوں پر
نظر نہ پڑ جائے۔

صبح کا ناشتہ ہمیشہ گریس ہی تیار کرتی تھی۔ ۶ ستمبر
۱۸۷۸ء کو جب وہ ناشتہ کے لیے اٹھی تو اس بات سے

”نعلابے خبر تھی کہ اس کی زندگی کا ناقابل فراموش دن آ پہنچا
ہے۔ اس روز مطلع ابر کو دھوا اور سندر کا مزاج ڈارلنگ
نظر آتا تھا۔ سراسر طوفان لائٹ ہاؤس کی چٹان سے بار بار
رہی تھیں اور سفید جھانک سطح سمندر پر پھیلتا جا رہا تھا۔ چھوٹے
دیم کی قریبی گاؤں میں چند روز کے لیے سیر سپائے کر گیا
ہوا تھا۔ دوسرے کھلنے سے ناسخ ہو کر ڈارلنگ وٹ ہا
چلا گیا اور گریس اور اس کی ماں روزمرہ کی طرح گھر کے
کام کاج میں لگ گئیں، سہ پہر کے وقت گریس کیڑے ستر
کر رہی تھی کہ اس کا باپ رتہ ٹھکانے زیر لب کچھ بڑبڑاتے
اندر داخل ہوا اور گریس سے کہنے لگا:

”آ رہے ہیں؟“
گریس نے خوفزدہ لگا ہوں سے باپ کی طرف دیکھا۔
وہ جانتی تھی موسم کے بانے میں اس کی رائے صرف آخر کی
جیتیت رکھتی ہے۔ یقیناً طوفان آنے والا ہو گا، تاہم اس سا
یونسی ایشیے کی کوشش تھی:

”ایسی کوئی بات تو نہیں ہے آہا جان،“ اس نے مڑکڑا
ہوئے کہا: ”ابھی چند منٹ پہلے تو مطلع بالکل صاف تھا“
گریس کے الفاظ کا فضا میں تحلیل بھی نہ ہوئے تھے
کہ باہر کھڑکی سے بارش کی بوجھل ٹھکانے کی آواز
سنائی دی اور ساتھ ہی ہوا میں شور مچنے لگیں۔ ڈارلنگ کی
پیشین گوئی صرف محض درست تھی۔ صرف پانچ منٹ کے
اندر اندر چاروں طرف گھپ اندھیرا چھا گیا، چاند نہیں
اپنے تیل کے چرچر بھلا نہ پڑے۔ ڈارلنگ بھاگ بھاگ
لائٹ ہاؤس پہنچ گیا۔ گریس کھڑکی سے لگی سمندر کی طرف
رہی تھی، مگر گھپ اندھیرے میں کیا نظر آتا؟ چاروں طرف
گھری ہوئی سیاہ بادلوں نے دن کی روشنی کو قفل لیا تھا۔
بارش کی بوجھل تیز تر ہو گئی تھی ہوا میں کسی زخمی پرندے

کی طرح ادھر ادھر پھرتی ہوئی شہر چار ہی تھیں شام تیرے
ہوتے۔ دہائیں خوفناک طوفان کی شکل اختیار کر گئیں۔ یہاں
تک کہ لائٹ ہاؤس کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا۔ ڈارلنگ نے حد
نہ پار نہ کیا، اس کا سپلا کام یہ تھا کہ جان بچھری پر رکھ کر
لائٹ ہاؤس کو روشن رکھے جس کے صبح اشادوں پر سینکڑوں
انسانوں کی زندگیاں وابستہ تھیں۔ گریس کے دل میں جذبات
کا طوفان اندر رہا تھا اور اس کا داغ سوچے سوچتے عاجز آ
چکا تھا۔ چاروں کی تحم کو اس نے اپنے سامنے سے بھی خوف
آنے لگا، لیکن وہ جی تو لگا کہ ایک باہر کھڑکی تک گئی۔
اس کی نگاہوں کے سامنے تاریکی کا وسیع سمندر تھا جس سے
یہ جہتہ ہواؤں کی ٹھنڈی ہوتی تھیں سنائی دے رہی تھیں
اس کی بوہیں آگھول ہیں آسمانوں کے آخری قطرے بھی
نجم ہو چکے تھے۔

اسی اندھیانے میں ایک بھری جہاز فوراً شہر چار پر
کے قریب ہی ٹکرانہ بوجھا پڑا تھا۔ جہاز کا اندر ایک پیشین جان
میل تھا، اسے اپنے اس پیشینے پر مڑنا تھا، تو سہ ہارس
پاد کے دواجنوں والے اس جہاز کو چار سال قبل سمندر میں
آنا لگیا تھا۔ بد قسمتی سے ہل سے روانہ ہوتے وقت اس کے
بالوں میں کچھ نقص پیدا ہو گیا تھا۔ اس کی جھاپ پر قاتار پانے
میں شکل پیش آنے لگی، جو ہی طوفان نے ذرا شہت اختیار
کی جہاز کے انجن والے کسی میں پانی تیر ہوا شروع ہو گیا،
چاند جہاز کو متوازن رکھنے کے لیے بار بار بار باروں سے
کام نہ پڑا۔ طوفان کے میپ سامنے بڑھتا جا رہا ہے جتنے
اور آدمی رات کے وقت تو یہ کیفیت تھی کہ کبھی سہل کو لائٹ
ہاؤس کا وہ میپ بھی نظر نہیں آتا تھا جو اس ڈوڑوئی رات
اور طوفانی ماحول میں اس کا واحد سہارا تھا۔ فوراً شہر
نیل بنے نہ پھر کی طرح بہرے پڑا ہوا جاتا تھا اور پھر

ہوئی ہو جی اسے لٹکے کے لیے چاروں طرف سے اندھری
تھیں۔ بد قسمتی جہاز میں مسافر بھی تھے اور خاصی مقدار میں
سامان بھی مسافروں کی کل تعداد تیرہ تھی۔ ڈارلنگ
بڑی خود اعتمادی سے لائٹ ہاؤس کے لرزتے ڈھانچے
ہوئے میپ سے ضروری اشیاء کے کونے میں مصروف تھا لیکن
گھر آؤ فضا میں اس کی کچھ گھٹنیں ناکام ثابت ہوئیں اور
بڑھتی ہوئی جہاز کے آخری لمحات میں فوراً شہر
ایک بڑی چٹان سے ٹکر کر پاش پاش ہو گیا۔

آن کی آن میں زبردست ہنگامہ رہا ہو گیا۔ خوفناک
دھماکے سے کئی مسافر فوراً ہی دھیر ہو گئے، کچھ انتہائی
افرا تفری کے عالم میں ایک دوسرے سے ٹکر کھاتے ہوئے اور
سمندر میں جا گئے۔ اس وقت بلا کی تاریکی اٹھی اور ہاتھ
ہاتھ بھائی نہ دیکھا تھا۔ بہت سے دہشت زدہ مسافر
اندھیرے سمندر میں جان بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے
تھے۔ کچھ لوگ زخمی حالت میں چٹان کا سہارا ڈھونڈنے لگے،
لیکن وہ اتنی پھسلوں تھی کہ کسی کے قدم جھٹ نہ پائے اور
وہ ایک ایک کے سمندر میں گرے اور جتنے چلا تے بے رحم
برقائی موجوں کے نذر ہو گئے۔ جہاز کے پھیلے جھتے میں
پھنسے ہوئے لوگ تیز و متکبر جہتہ ہواؤں کے پھیلنے والے
اڑ کر گرے گئے، صرف اگلے جھتے میں تیرہ مسافر زندہ بچے
تھے اور درہ کسی نہ کسی طرح رینگ رینگ کر شہر جہاز کے
مستولوں تک پہنچ گئے۔

گریس کچھ دیر تک سمندر پر نگاہیں گاڑے کھڑی رہی
پھر ایک دم جیسے جو تک سی گئی جلدی جلدی لائٹ ہاؤس
تک آئی اور بجلی کی سی سرعت کے ساتھ بیڑیاں بچھلا گئی
ہوئی اپنے باپ کے پاس پہنچ گئی۔

”آؤ میرے خدا، یہ رات کتنی لمبی ہو گئی ہے، اس
نے گہرا سانس لے کر کہا اور فی الواقع یوں محسوس ہوتا تھا جیسے

وقت ریگ رہا ہے، مہج کا ذب کے وقت اسے یقین ہو گیا کہ جھوٹے شور مچانے کے ساتھ ساتھ اسے بے شمار انسانوں کے رونے اور کہنے کی دردناک آواز بھی سنائی دے رہی ہیں۔
 ”آہا جان... آہا جان، مجھے محسوس ہوتا ہے... میرا دل کہتا ہے مجھ کو بڑی مصیبت میں پھنسے ہوئے ہیں۔“
 ”اتنی کہیں گی؟ اس کے باپ نے جواب دیا: ”معلوم ہوتا ہے تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ بیچل! اس اندھیری رات کے خوفناک طوفان میں جہاز کی تباہی کے بعد جھوٹا نذرہ نہ ملتا ہے۔“

”مگر آہا جان میں نے اپنے کانوں سے ان کی چیخ و پکار سنی ہے۔“ گریس نے کہا۔

یہ آواز کی تھی، ایک انہول تھا جو اس کے کانوں میں گھونکھونکھوٹا جا رہا تھا، لیکن ڈارلنگ بھی جانتا تھا اس سہنگامے میں تو کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی اور اگر کچھ لوگ اس قیامی سے بھی بھی گئے ہیں تو ان کی آواز لارنس ہاؤس تک نہیں پہنچ سکتی۔

— اور جب اندھیرا چھا اور روشنی نمودار ہوئی تو باپ بیٹی نے دیکھا تو در فطر شاہ کا اگلا ڈھانچا تیز رہا تھا۔ اس کے تنوں کے ساتھ کئی انسانی جسم لہرائی ہوئی جھٹیلوں کی طرح تلک رہے تھے۔

گریس کے دل میں جذبات کا سیلاب اٹھ آیا۔
 ”اٹ میرے اللہ! وہ چلائی، آہا جان! ذرا دیکھیے تو ان بھاریوں کو غضب کی سروری میں برفانی ہواؤں کے چھیلوٹوں سے مرے جاتے ہیں! ہمیں ان کی مدد کرنا چاہیے۔“
 ”مد؟“ وہ لائی کہیں کی مدد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ طوفان کی ابھی تک وہی کیفیت ہے اور ہمارے پاس ایک طاقت بٹھی ہے جو وہ نہیں اور اگر اس کا بددست ہوجا جائے تو اس شکستہ جہاز تک پہنچنا نامکن ہے۔“

”مگر ہم نہیں پا رہی کشتی میں تو لاسکتے ہیں۔“
 ”میری بچی، مستو! ڈارلنگ بولا۔ وہ لوگ یہاں سے تقریباً ایک ہزار گز کے فاصلے پر ہیں، ہمیں وہاں تک پہنچنے کے لیے ایک میل کا چکر لگانا پڑے گا۔ اگر مسئلہ مروجوں کے لیے چاہے چند بیڑوں اور زبردست چٹانوں سے محفوظ رہ سکیں۔ ذرا سوچو تو اس طوفانی موسم میں ہماری چھوٹی سی کشتی بھلا وہاں تک کیسے پہنچے گی؟“
 گریس کی آنکھیں بڑبڑا گئیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”نہیں نہیں! آہا جان ہمیں ضرور وہاں جانا چاہیے۔“
 ”... ہمیں ضرور وہاں جانا چاہیے۔“

وہ بار بار یہی الفاظ دہرائی رہی۔ اس کے دل میں بھلی برج رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ سمندر میں کود کر ان فلاکت زدہ انہولی مسافروں تک پہنچ جائے جن کا سب کچھ لٹ چکا تھا اور صرف زندگی کی ایک مومرمی امید پر اپنے ٹھٹھکے ہوئے سیدن سے لگائے کسی آنے والے کا انتظار کر رہے تھے۔

بیٹی کو اس طرح مضطرب دیکھ کر ڈارلنگ بے حد متاثر ہوا۔ ”واقعی ان قباہ حال مسافروں کی فوری مدد کرنا ضروری ہے۔“ اس نے دل ہی دل میں کہا۔
 گریس کو ساتھ لیا، لارنس ہاؤس سے اُترا اور منہ ڈارلنگ کی مدد سے کشتی کو سمندر میں اتار دیا۔ یہ کام بڑے جان بوجھوں کا تھا۔ تیز تیز ہوا کی وجہ سے وہ تینوں سیدھی طرح کھڑے بھی نہ ہو سکتے تھے۔ یہ چھوٹی سی چار چھوٹی ڈالی کشتی تھی۔ ڈارلنگ نے تو بائیں سمت کے دو چتر سنبھال لیے، گریس دائیں طرف بیٹھ گئی اور چتر چلانے لگی۔

کشتی قدم قدم پر جھکے لے گئی تھی، پانی کا ہواؤ تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ کشتی بھی بار لٹنے لگتی تھی۔

ڈارلنگ تندرست و توانا اور بڑا جانا دکھو تھا لیکن طوفانی ہولوں کا دباؤ نہایت شدید تھا۔ اسے زبردست جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی۔ اندھیر گریس کا عجیب عالم تھا اس کے دونوں ہاتھ فولادی پنجوں سے کمین زیادہ مضبوط نظر آ رہے تھے۔ وہ کچھ ایسی ہنرمندی اور تیزی سے چتر چلا رہی تھی جیسے کوئی زبردست نوجوانی قوت اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے۔
 اُس کی نگاہیں صرف ان ستاروں پر مرکوز تھیں جن پر وہ نکلے ہائے انسان کا توازن پرندوں کی طرح پھر چلا رہے تھے۔ اور پر نیکیوں آسمان تھا اور نیچے چاروں طرف طوفان ہی طوفان۔ برج بننے ہواؤں کے مسلسل چتر چڑھنے سے ان کے جسم اکڑنے لگے تھے۔ آخر انہوں نے مستول چھوڑ لیے، پانی میں کود گئے اور دوڑتے ابھرتے چٹان کے نکلے ہوئے پتھر پر پہنچ گئے۔ اندھ ڈارلنگ اور گریس مروجوں سے لڑتے، ٹکراتے اور منہ نہ کرا سکتے ہوئے ان کے قریب جا پہنچے۔ اب انتہائی سنگین حملہ درپیش تھا۔ ان لوگوں کو بچانے کے لیے ضروری تھا کہ باپ بیٹی میں سے کوئی ایک لارنس ہاؤس کی چٹان پر اُتر جائے۔ ڈارلنگ نے بڑی چھرتی سے ایک کرچان کے نکلے ہوئے حصے کو پکڑ لیا اور ریگ کر اوپر چڑھنے لگا۔ اس عرصے میں گریس نے بڑی بہمت اور دلیری سے کام لیا۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے کشتی کو سنبھالے رکھا، پھر بڑی تیزی سے چتر چلائی، ہوئی چٹان کے دوسری طرف پہنچ گئی جہاں بے رحم مروجوں کا زور نہایت کم تھا۔ چتر چلاتے چلاتے اس کے نازک ہاتھ بالکل شل ہوئے جاتے تھے اور برفانی ہوا کے چھیلوں سے جسم نیلا رہ گیا تھا۔

ڈارلنگ باہر اچھلتا تھا۔ چٹان پر اُتر کر ریگ کر ان کے قریب پہنچا، تو یہ دیکھ کر اس کے رونے لگے۔ کھڑے ہو گئے کہ کچھ چھ مسافروں میں سے چار تو دم توڑ چکے ہیں باقی نو نیم مردہ حالت میں پڑے تھے۔ پانچ کو

جان بچا کر کشتی میں اتار دیا۔ گریس تن تنہا نہایت مضبوطی سے تھلے کھڑی تھی۔ جو بھی ان خستہ حال اور قریب لوگ انسانوں کا بوجھ پڑا کشتی ڈوبنے لگی۔ ابھی چار مسافر چٹان پر باقی تھے انہیں دوسرے پھیرے ہی میں لے جایا جاسکتا تھا، چنانچہ انہیں وہاں چھوڑ کر ڈارلنگ کشتی میں سولہ ہو گیا۔ باپ بیٹی نے پھر چتر سنبھال لیے۔ کشتی تھلا مروجوں سے ٹکراتی جھکے لگتی تھی۔ لارنس ہاؤس تک پہنچی مسافروں کو اتار کر سر ڈارلنگ کے حوالے کیا اور خود ایک منٹ منافع کے بغیر دونوں باپ بیٹی پھر چٹان کی طرف روانہ ہو گئے۔

اب پھر وہی طوفان تھا اور وہی باپ اور بیٹی۔ ان کے قوی باطل جاب دے گئے تھے۔ متواتر چتر چلانے سے ڈارلنگ کی سانس پھیل چکی تھی۔ گریس بے جا دلیری کی توہمیں بڑیاں چرچمچتی تھیں۔ اس کا ایک ایک بند درد کر رہا تھا اور جسم کا خون گویا جم رہا تھا۔ وہ کشتی کی بڑی بڑی بہمت سے چتر چلانے میں مصروف تھی۔ کچھ بھی اس کے ذہن سے اختیار نہ کئے۔ لارنس ہاؤس کی ایک پھاٹ سے چتر چلا کر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی، لیکن باقی ماندہ چار مسافروں کو بچانے کا احساس اُس کے اندر فوراً ایک عزم اور ولولہ پیدا کر دیتا اور وہ نئی قوت کے ساتھ چتر چلانے لگتی۔ آخر تندرست و توانا اور تیز و سہم مروجوں سے ٹکراتے، گرتے پڑتے وہ ایک بار پھر اُس چٹان تک پہنچ گئے۔ ڈارلنگ نے ایک ایک کر کے چاروں مسافروں کو بحالیت اپنی کشتی میں اتارا اور پھر دونوں باپ بیٹی ایک جگہ جانوں کی بازی لگا کر باہتے کاچپتے انہیں لارنس ہاؤس تک لے کر میں کامیاب ہو گئے۔

ان انتہائی خطرناک حالات میں ان سب کا صحیح سلامت واپس پہنچ جانا واقعا انسانی جرأت و بہمت کا

اسے قدر خوفناک آوازیں ہیں، تیز اور تیز، وہم حقیقت میں بدلے گیا تھا۔۔۔ میرے خدا یہ سب کیا ہے؟

حویلی کی آگ

سنھیا ایکوٹھ



ہو گئے۔ گریس کو ہزار ہا خطوط اور تحائف بھی ملے اور بعض مذاہن نے تو اس سے اپنی زلف کی ایک ٹسٹ بھیجنے کی بھی فرمائش کی۔

آخر اس طوفانی رات کے جانکاہ واقعات نے گریس سے اپنا انتقام لے ہی لیا۔ برٹانی ہواؤں اور سمندر کی متلاطم موجوں نے اس کے جسم و جان کو مری طرح ستا کر لیا تھا۔ اس کی صحت روز بروز گرنے لگی۔ بالآخر وہ دق جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو گئی اور مسلسل لمبی برس تک اس اذیت ناک مرض کی صعوبتیں برداشت کر کے چھبیس برس کی عمر میں مر گئی۔

وہی واقعہ جس نے اسے شہرت دوام بخشی، اس کی موت کا فریبہ بن گیا۔ اس کی بادیوں لندن کے میونسپل پارک میں ایک پولڈ انگلیا گیا جو آج بھی ایک خوبصورت درخت کی صورت میں موجود ہے۔ ۱۹۲۸ء میں ایک گریس ڈارنگ میوزیم بھی قائم کیا گیا، لیکن اس سلسلے کی سب سے دردناک گواہی ٹائٹلر، لندن کے ذاتی کالم میں بھیجنے والا ایک اشتہار تھا، اس میں کہا گیا تھا: ”گریس ڈارنگ کے بالوں کی ایک ٹسٹ سونے کی ڈیا میں محفوظ برائے فروخت موجود ہے۔“

ایک حیرت ناک واقعہ تھا۔ سڑکوں اور گریس کو تیز ترین شہر اور دیکھ بھال کرتی رہیں، مگر اس طوفانی ہم کے بعد گریس کی بہ نسبت بڑی عظیمی اور اسے آرام کی اشد ضرورت تھی۔ چوتھے روز طوفان کا دور ٹوٹا، تو ڈارنگ نے ان نرسوں کو جن میں مناسب مقامات پر پہنچایا اور ساتھ ہی اس واقعہ کو سرکاری رپورٹ بھی حکام بالا کو بھیج دی جس میں گریس کے بارے میں ایک لفظ تک نہ لکھا۔ یہ چھوٹا سا گھر اپنے گھر میں پہلے کی طرح سناٹا ہی سے دن گزارنے لگا۔ ان کے خیال میں معاملہ ختم ہو چکا تھا، لیکن فورزش ٹرک کے نیچے کچے مسافر جن کی دھندلائی ہوئی نظریں اس بے مثال احسان مندی سے جھلک اٹھی تھیں، اس نازک اندام لڑکی کی جراثیم اور جہاں ننداری کو کیسے قبول کئے تھے۔ ان کی آن میں اس واقعے کی خبر جھٹک کی آگ کی طرح پھیل گئی، گریس کی بہادری کے چرچے ہر زبان پر تھے۔ اس کے لیے ایک خاص فنڈ بنائی گیا جس میں ملکہ وکٹوریہ نے اپنے عزیز خاص سے پیاس پاؤنڈ کا عطیہ دیا۔ دونوں باپ بیٹی کو سونے کے کئی شے ملے اور چند روز کے اندر ان کے ہاں ملاقاتیوں اور اخباری رپورٹروں کا تاج بندھ گیا۔ اس واقعے کی اہمیت روز بروز بڑھتی گئی اور لوگ دور دراز ملکوں سے باہر آنا شروع



لالہ بیارڈ

کاوشی سے تڑا مال تھا، لڑیں بیٹھے چلے آئے اپنے خواہوں کی نسیبوں جانے کی اب اس کے دم دھن میں مدد تھا۔ اتنے دن گزرنے کے بعد وہی وہ خواہوں کی سرگرمی نہایت میں سرشار تھی۔ وہ ہر پارک کی چرت اور خوشی سے آگاہیں ل کر اپنے شے کو کو بھتی اور خود کو کوئی ہائی ٹیکنیسی ہر پارک کے پڑھ رہے تھے۔ نیا مکان تھا ہی اشتہار۔۔۔ ہر پارک کے پڑھ رہے تھے۔ نیا مکان تھا ہی اشتہار۔۔۔

زمین کے وسیع و عریض ٹکڑے پر پہلی کھلی ٹھکانوں کی ٹکڑیوں میں پڑھ رہے تھے۔ نیا مکان تھا ہی اشتہار۔۔۔

لالہ کے خاندان کا ڈیڑھ دو چھ بیٹے ہر صدفی ہاشاد دھتے میں ملی تھی جو اس کا بڑا اسلاوہ جانی چھوڑا تھا۔ لالہ نے ایک طویل عرصہ اپنے لندن کے آبائی قصبے سے گھر پارک میں گزارا تھا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہاں ادا ادا سنہ کر سیر پار دیجیے۔

شب بخیر فادو! پھر کہنے کا: لانا نے شینی انداز میں کہہ
ادہ پادری کے ہانے کے بعد اس کی طرف رخ کرتے ہوئے اس نے
بیدھیائی مگر اضطراب میں نکلی کے لئے کہ شوگر پادری ادا گئی
دیکھ کر اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک وہ شعلوں میں بکھری ہوئی
گھر نکلی۔

لادو کو اس کی ادا ایک ماسلم شغل سے فراموش طور پر گھر گیا اور
پھر اپنا تک ہی سہی اسے اپنی قبروں میں پہنچتی ہوئی موسیٰ بڑھنے لگی۔
وہ جانے کنی خیال میں گھری ہوئی آگ کے شعلوں کو گھومتے پادری
تھی کہ پادری کو دوبارہ اس کے آسے پر نکال دیا۔ وہ اپنے دستوں بھرنے
گیا تھا۔ اس نے کتنی ہی مسندت کی ادا دستاویز کے بارے میں
پوچھا کہ لانا نے کسی کسی قصہ کے بغیر یہ آگوں رنگ کے ہی ہائے
کچھ خیال دیتا کہ وہ کیا کر رہی ہے، اگرچہ گھر سے رنگ کے
دستانے وہیں صوفے پر پڑے ہوئے تھے۔

"اے ادا پڑے ہی؟ پادری سے دستے دیکھئے، نیچے الماس
سہہ جس سے آپ کو زبردستی وہ ہانے کے لیے نکلا۔

"مشرقیہ فادو!۔۔۔ میں آپ کے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔
میرے خاوند سے آپ سنا ہے؟ اس نے وہ آپ کو کیا دیا؟

بہت اچھا۔۔۔ وہ ہمیشہ سے ایک بڑی خوشامد شاد
فصیحت کا مالک رہا ہے۔ بہت شاندار۔۔۔ میں گھر کا پلے
پوچھا تو کچھ خیال آیا۔۔۔ میں نے اس کے چہرے پر عجیب تاثرات
دیکھے ہیں۔۔۔ اس کا چہرہ۔۔۔ اس کی آنکھیں۔۔۔ گھر سے دیکھ کر میں
فطرتاً ہی۔۔۔ جیسے۔۔۔ وہ کسی گھری اور دیکھ دینے والی سوچ میں گم
ہو گیا ہو۔۔۔ میں نے واقعہ دیکھ کر ہی خوشی میں ہو گیا۔
بہت دیکھ کر کچھ کچھ دیکھا ہے۔۔۔ ہاں! یہ پادری یا اسے اسے ڈال
رہی ہے۔

"کوئی یاد؟"

نہیں۔۔۔ ایسا ہی لگتا ہے۔۔۔ مگر یہ کنیت عارضی ہو سکتی ہے
ہو سکتا ہے۔۔۔ وہ بھی کوئی کاد پادری مصروفیات نے اس کی یہ
حالت بنا دی ہو۔۔۔ شہر کی زندگی میں ہی ایسی ہنگاموں سے پر ہوتی ہے۔
اس نے تو پھر نہ۔۔۔ اگرچہ۔۔۔ یہ ہنگاموں سے نکلا ہی گاؤں میں
گھرا تھا۔۔۔ وہ لایا۔۔۔ ہوا ہے۔۔۔ اب وہ ہنگاموں

سے نکلا ہے۔۔۔ وہ تو پیدائشی گاؤں کی زندگی کے لیے گھرا تھا۔
شب بخیر فادو!۔۔۔ شب بخیر۔
لادو اس پر اس گم تھی۔ پادری کی طرف دیکھ کر شعلوں کو گھومتے
ہوئے وہ جیسے بڑ بڑائی۔ شب بخیر۔۔۔ وہ پیدائشی گاؤں کی زندگی
کے لیے گھرا تھا۔

میں۔۔۔ اسے دیکھ کر ہوشیار خیال میں نہ رہا تھا۔ اس
بے ہم تاثر کو وہ ایک عجب کوئی نام نہیں دے سکتی تھی۔ آج معلوم ہوا
بات تھی۔۔۔ اس کے گھر میں لانا ایسا لگتا تھا جیسے وہ جلاوطن ہوا اور اپنی
زندگی کے لیے قفس رہا ہو۔۔۔ گھر۔۔۔ گھر۔۔۔ گھر۔۔۔ وہ اپنی گھر کی
جنت میں آگیا ہے۔۔۔ وہ اپنی سبب جوئی میں ہے۔ اسے بتانے
سنوارنے میں ملتا رہا ایک کر رہا ہے۔

اس نے جوئی کی آواز میں مزاحیہ مائل ہی بدل کر اسے اور وضاحت
بنا دیا ہے۔۔۔ اب وہ اس کنیت سے دھما کر سیر ہے؟ اب
اسے کون فہم ہے؟ ان نئی نئی سیروں نے لادو کو پریشان کر کے رکھا دیا۔
پادری سے لنگھ کر بے دستے وہ محسوس کر رہی تھی کہ بیدار فاضی
ایک پوچھ سے دبا محسوس ہوتا ہے۔ وہ پھر سوچنے لگی کہ اس کا سبب کیا
ہو سکتا ہے؟۔۔۔ اب اس کا ہاں نہیں دیکھ کر اس پوچھنے سے
کچھ کو پتا نہ آتا۔۔۔ مستقبل صاف نظر آ رہا تھا۔۔۔ بڑا بڑا زمانہ کیا جائے
اسی تھی کہ وہ ساری زندگی کا یہ بڑا خوشامد شعلے سے گزرتے تھے۔
سوچتے سوچتے اس کا ذہن کاد پادری کی طرف گیا۔۔۔ بڑی کی فکر و غم
کی کلاؤں کی فکر ہوئی؟ خیر یا ایک میں ان کا بڑی شعلے کی طرح تھا۔

کو بڑی کے ایک ایک پہلو کا ظہور تھا۔ وہ اسے ایک ایک بات بتا دیتا
تھا۔ لادو اس کے اس مرحلے پر پہلے فقیر لنگھ کر ایک ایک پہلو پہلے
ہی وہ ایک ناول پڑھ رہی تھی۔ یہ بڑا بڑا زمانہ لپٹنے خاندان کے لفظ
سے محسوس تھا۔ واقعتاً ہی اور اسرار کی تھی کہ وہ اپنے شہر کے ہر ماں
سے واقف ہے۔ وہ اسے ہر بات بتا دیتا ہے۔۔۔ اب وہ فہم کی
طرح لگ رہی تھی۔ اس کے شعلوں میں یہ بات بڑی بڑی تھی کہ پادری کے
ذہن میں کوئی بڑا مرد ہے۔۔۔ اس کے شہر کا دورہ ہی ایسا تھا۔

اس قصباتی جوئی میں گئے کے بعد آج پہلے لادو نے اپنے شہر
کے درمیان جہتیت کی ایک دیوار بلند ہوتے محسوس کی۔ پہلے تو
وہ کسی پچھلے ہوئے تو کسی بارے پچھتے چاہل بات بتا دیتا مگر
اب تو وہ گھر کا محنت کے بارے میں پچھتے ہوئے تھا۔۔۔ کیا جیسا

۱۔۔۔ لادو بھی اپنے پاس دیکھ رہی تھی۔۔۔ لادو بھی
۵۵

لادو اس سیر میں گم تھی کہ اس کا بلند قامت، درجہ اول شہر
کے میں داخل ہوا۔ اس میں اس کی بیٹی کوئی اس کے کا زعفران پر مدار
تھی۔ اس کے سر پر بال زندگی میں چہرے پر کچھ بے ہوش تھے اور
بڑی بڑی آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ وہ خوشی سے بے حال باپ سے
لاڈل کر رہی تھی۔

میں ان کے سلسلے پیڑھے گئے۔۔۔ اب اسے لادو سے ایک
کتاب نکالی اور ایک دلچسپ باب پڑھ کر اس کو سنا دیا۔ لادو نے
استغنیوں کے پچھلے میں بیٹھ کر چہرہ سنا دیا۔ وہ خوشی سے
اس کی بڑی بڑی آنکھیں شعلوں پر مچی ہوئی تھیں اور زیادہ دیکھ رہی
تھیں۔ وہ ایک سنا پکا، تو رانی سنہ آٹھ گھڑی ہوئی۔ اب اس میں جا
سکتی ہوں؟

باپ نے اسے محنت پوری دکھا دی۔۔۔ وہ اس کے ہر ہر
تہائی سے پریشان تو نہ ہوتی ہوئی؟

مستثنائی؟۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔ میں تو یہاں کسی ایک میں رہی۔
کچھ یاد رکھو کہ وہ لنگھ کر اس پر مچی۔۔۔ اب کچھ جانا چاہیے۔۔۔ اب

کی پیشانی پر گم تھی کہ باروں سے پہنچی ہوئی پادری کی۔۔۔ لادو نے
اس کے دوش سے دھرا اور کتنی ہی اس کی ادا دہرے ہوئی ہوئی تھی، کہ
اس نے لادو سے پوچھا۔۔۔ لادو نے اسے یہ بات کیا کہ وہ۔۔۔ میں تو
یہاں کبھی آئی نہیں رہی؟

اگر سب بات ہے۔۔۔ لادو جیسے اس بات کا انتظار کر رہی تھی۔
اب جب تم نے پوچھ لیا ہے۔۔۔ تو بتاؤ کہ میں وہ بدل بدل رہی ہوں
تھیں۔۔۔ وہ ان کے قدر کے لیے نہایت خوش رہتی تھی۔۔۔ کچھ سے
ذرا رنگ نہیں ہوئی تھی اور ہر وقت کوئی کتاب یا کتاب پڑھنے کی
فرمائش کرتی تھی۔ مگر اب تو وہ نہیں سبیلوں کی تلاش میں رہتی تھی۔
اس قدر شوق اور فاضلی ہو گئی ہے کہ یہاں سے باہر۔۔۔ وقت
بہت دقت کیل میں گئی رہتی ہے۔

"اچھا افسی؟"

اگر کیا۔۔۔ اب تو اسے لادو کی دیر پاں پھیلنے کے لیے
ڈانٹ ڈپٹ کر لپٹی ہوئی ہے۔۔۔ ہر وقت ماہر ہونا چاہتی ہے۔ اسے
لپٹ کر لپٹا دیتی ہے۔۔۔ اب اسے لادو۔۔۔ ہر وقت اس کے

۱۔۔۔ لادو بھی اپنے پاس دیکھ رہی تھی۔۔۔ لادو بھی
۵۵

لادو اس سیر میں گم تھی کہ اس کا بلند قامت، درجہ اول شہر
کے میں داخل ہوا۔ اس میں اس کی بیٹی کوئی اس کے کا زعفران پر مدار
تھی۔ اس کے سر پر بال زندگی میں چہرے پر کچھ بے ہوش تھے اور
بڑی بڑی آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ وہ خوشی سے بے حال باپ سے
لاڈل کر رہی تھی۔

میں ان کے سلسلے پیڑھے گئے۔۔۔ اب اسے لادو سے ایک
کتاب نکالی اور ایک دلچسپ باب پڑھ کر اس کو سنا دیا۔ لادو نے
استغنیوں کے پچھلے میں بیٹھ کر چہرہ سنا دیا۔ وہ خوشی سے
اس کی بڑی بڑی آنکھیں شعلوں پر مچی ہوئی تھیں اور زیادہ دیکھ رہی
تھیں۔ وہ ایک سنا پکا، تو رانی سنہ آٹھ گھڑی ہوئی۔ اب اس میں جا
سکتی ہوں؟

باپ نے اسے محنت پوری دکھا دی۔۔۔ وہ اس کے ہر ہر
تہائی سے پریشان تو نہ ہوتی ہوئی؟

مستثنائی؟۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔ میں تو یہاں کسی ایک میں رہی۔
کچھ یاد رکھو کہ وہ لنگھ کر اس پر مچی۔۔۔ اب کچھ جانا چاہیے۔۔۔ اب

کی پیشانی پر گم تھی کہ باروں سے پہنچی ہوئی پادری کی۔۔۔ لادو نے
اس کے دوش سے دھرا اور کتنی ہی اس کی ادا دہرے ہوئی ہوئی تھی، کہ
اس نے لادو سے پوچھا۔۔۔ لادو نے اسے یہ بات کیا کہ وہ۔۔۔ میں تو
یہاں کبھی آئی نہیں رہی؟

اگر سب بات ہے۔۔۔ لادو جیسے اس بات کا انتظار کر رہی تھی۔
اب جب تم نے پوچھ لیا ہے۔۔۔ تو بتاؤ کہ میں وہ بدل بدل رہی ہوں
تھیں۔۔۔ وہ ان کے قدر کے لیے نہایت خوش رہتی تھی۔۔۔ کچھ سے
ذرا رنگ نہیں ہوئی تھی اور ہر وقت کوئی کتاب یا کتاب پڑھنے کی
فرمائش کرتی تھی۔ مگر اب تو وہ نہیں سبیلوں کی تلاش میں رہتی تھی۔
اس قدر شوق اور فاضلی ہو گئی ہے کہ یہاں سے باہر۔۔۔ وقت
بہت دقت کیل میں گئی رہتی ہے۔

اگر کیا۔۔۔ اب تو اسے لادو کی دیر پاں پھیلنے کے لیے
ڈانٹ ڈپٹ کر لپٹی ہوئی ہے۔۔۔ ہر وقت ماہر ہونا چاہتی ہے۔ اسے
لپٹ کر لپٹا دیتی ہے۔۔۔ اب اسے لادو۔۔۔ ہر وقت اس کے

”وہ اگرچہ موقوفہ الفطرۃ علوم پر ایک
ناور فستحق تھا، لیکن فیہ میں نے کمرے میں
داخل ہو کر اُسے منحوس سے کتابیہ کو
آتش دافہ میں پھینک دیا اور۔۔۔“

محبوبہ کی رُوح

متور جاوید



مجھے ہمیشہ کہ کتاب خیر ہے اس وقت شاک میں
”غیباً“ موجود نہیں ہے۔ سبیل میں نے بڑے پڑا تھا مجھے میں
کہہ سکتا ہوں کہ یہاں سے مجھے ایسی ہی ہوئی اور قدر سے میری ہی تھی
کتابوں کی فروخت مجھے صبح کی ڈاک ہی سے لی تھی۔ ناشتے کے دوران میں نے
فروخت پر سرسری سی نظر ڈالی اور کتابوں کا تعارف پڑھتے ہوئے اپنے ہاتھ پر
مذکورہ پر ڈک گئی۔ کتاب کے منظر سے تعارف کے مطابق یہ نثر سترہویں
صدی میں لکھنے والے دور سے تعلق رکھتا تھا جس میں زبان قدیم کی قویوں
کے مذہبی عقائد کے ساتھ ساتھ زعموں کو بٹانے اور ان سے ہم کلام ہونے
کے ذہنی مختلف طریقے، لکچے اور وظائف درج تھے۔ علاوہ ازیں وہی اور
ہجو دیوں کے طبع ابرواح اور ان سے ہم کلام ہونے کے پراسرار طریقوں کا بیان
بھی ایک باب میں تفصیل سے درج کیا گیا تھا۔

گزشتہ پچیس برسوں میں علم اور ان کے موضوع پر اگرچہ کتاب
میرے مطالعے سے گزری تھیں، لیکن اس نکتے کے متعلق تو۔۔۔ میں کچھ تو
پائیں نظر آ رہی تھیں اور مجھے یقین ہو چکا تھا کہ یہ سترہویں صدی کے
کے نامور ادیب شہرت یافتہ ابرو کوئی ہی نہ تھا جس کی تصانیف یہاں
مفروضہ درست ہے تو پندرہ پانچویں صدی میں لکھی گئی تھیں۔
پانچویں صدی جلدی جانتے مطلق میں انڈی اور میلاوٹی مجھے کہ

میں نے سترہویں صدی میں علم اور ان کے موضوع پر اگرچہ کتاب
میرے مطالعے سے گزری تھیں، لیکن اس نکتے کے متعلق تو۔۔۔ میں کچھ تو
پائیں نظر آ رہی تھیں اور مجھے یقین ہو چکا تھا کہ یہ سترہویں صدی کے
کے نامور ادیب شہرت یافتہ ابرو کوئی ہی نہ تھا جس کی تصانیف یہاں
مفروضہ درست ہے تو پندرہ پانچویں صدی میں لکھی گئی تھیں۔
پانچویں صدی جلدی جانتے مطلق میں انڈی اور میلاوٹی مجھے کہ

میں نے سترہویں صدی میں علم اور ان کے موضوع پر اگرچہ کتاب
میرے مطالعے سے گزری تھیں، لیکن اس نکتے کے متعلق تو۔۔۔ میں کچھ تو
پائیں نظر آ رہی تھیں اور مجھے یقین ہو چکا تھا کہ یہ سترہویں صدی کے
کے نامور ادیب شہرت یافتہ ابرو کوئی ہی نہ تھا جس کی تصانیف یہاں
مفروضہ درست ہے تو پندرہ پانچویں صدی میں لکھی گئی تھیں۔
پانچویں صدی جلدی جانتے مطلق میں انڈی اور میلاوٹی مجھے کہ

میں نے سترہویں صدی میں علم اور ان کے موضوع پر اگرچہ کتاب
میرے مطالعے سے گزری تھیں، لیکن اس نکتے کے متعلق تو۔۔۔ میں کچھ تو
پائیں نظر آ رہی تھیں اور مجھے یقین ہو چکا تھا کہ یہ سترہویں صدی کے
کے نامور ادیب شہرت یافتہ ابرو کوئی ہی نہ تھا جس کی تصانیف یہاں
مفروضہ درست ہے تو پندرہ پانچویں صدی میں لکھی گئی تھیں۔
پانچویں صدی جلدی جانتے مطلق میں انڈی اور میلاوٹی مجھے کہ

میں نے سترہویں صدی میں علم اور ان کے موضوع پر اگرچہ کتاب
میرے مطالعے سے گزری تھیں، لیکن اس نکتے کے متعلق تو۔۔۔ میں کچھ تو
پائیں نظر آ رہی تھیں اور مجھے یقین ہو چکا تھا کہ یہ سترہویں صدی کے
کے نامور ادیب شہرت یافتہ ابرو کوئی ہی نہ تھا جس کی تصانیف یہاں
مفروضہ درست ہے تو پندرہ پانچویں صدی میں لکھی گئی تھیں۔
پانچویں صدی جلدی جانتے مطلق میں انڈی اور میلاوٹی مجھے کہ

میں نے سترہویں صدی میں علم اور ان کے موضوع پر اگرچہ کتاب
میرے مطالعے سے گزری تھیں، لیکن اس نکتے کے متعلق تو۔۔۔ میں کچھ تو
پائیں نظر آ رہی تھیں اور مجھے یقین ہو چکا تھا کہ یہ سترہویں صدی کے
کے نامور ادیب شہرت یافتہ ابرو کوئی ہی نہ تھا جس کی تصانیف یہاں
مفروضہ درست ہے تو پندرہ پانچویں صدی میں لکھی گئی تھیں۔
پانچویں صدی جلدی جانتے مطلق میں انڈی اور میلاوٹی مجھے کہ

”آپ میری دکان کے میز سرکش کو اچھٹا کر جاننے بولے گے؟
”ہاں ان کیوں نہیں؟ میں نے کہا۔ اس دکان میں دین کو تو میں گزشتہ
پندرہ سال سے دیکھ رہا ہوں۔“

غیر اخیال ہے اس سے پہلے میں نے دکان کے بارے میں آپ کو کچھ
نہیں بتایا۔ انکسٹن کے چرے پر بھڑکے آئندہ نواہر سے تھے۔

”غرض ۱۹۱۳ء میں انکسٹن ڈے یقین منی کر کے کہ کسی عزت کی
غرض سے لندن آیا تھا۔ جلد ہی میمنوں میں جنگ عظیم اول کے شعلے بھڑک
اٹھے اور برٹش کو بھی بری ہوتی کر لایا۔ اس طرح جوانی کے چار سال تک
وہ آگ اور دھواں کا ڈرامہ مختلف حادثوں پر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

سبک دہا کی یاد میں وہ اپنے ہمدردانوں اور ایسے ہی بڑائی کو اشیاء
واقعات نے اس کا حساس ذہن بھجور کر رکھ دیا اور تیز و بدیدہ تہذیب
کی متغیر بازی اور اصول اقتدار کے لیے انسانی خون کی اراڑائی کو دیکھ کر صاف
سے مشتعل ہو گیا۔ ۱۹۱۸ء میں فوج سے فارغ ہوا۔ لیکن ذہنی طور پر
اور ایک احمقانہ دلیل میں کر۔

دین والی اس نے پڑھتے مسلم لڑکے کی آگ میں اس کے والدین
بھی جسم جو پٹکے ہیں۔ غرض کہ میرے اس پرستہ ملای ہو گیا۔ گرامر کے
کو دور۔ زخمی ہونے کے لیے اب بھی اسے کسی عزت کی ضرورت تھی اور
اسی غرض سے وہ میرے پاس آیا تھا۔ میری دکان میں وہ پندرہ برس تک رہا
ایمانداری اور جانفشانی سے کام کرتا رہا۔ کچھ کچھ انکسٹن کی آنکھوں کے
بھیک گئے اور آواز ہو گئی۔ قدرے وقف کے بعد اس نے سلسلہ کام جاری
رکھتے ہوئے کہا۔

”دکان کے دوسرے معاملات کے علاوہ دین کا اصل کام نئی آنے والی
کتابوں کی بازار فروخت تیار کر کے کتابوں کو دکان پر رکھنا تھا۔ اسے سالانہ
کافی شرحی تھا۔ کتابوں کا تعارف لکھنے کے لیے اسے بیشتر کتابوں کو پڑھنا
پڑنا تھا۔ چنانچہ وہ دن رات کتابیں پڑھتے اور تعارف لکھنے میں مصروف رہتا
گزشتہ پچیس برسوں کی فطرت کے متعلق یہاں تعارف دین کی ہی عزت کا
نتیجہ ہے۔ وہ قدرے تنگ حراج بھی تھا اور اپنی طبیعت کے خلاف عملی
ہمت بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ لیکن اس کی ذہنی کیفیت مجھے میں زیادہ
ذہنی اصل میں سامنے کے متغیر واقعات نے ذہنی انتشار کے سوا اسے کچھ
دیا تھا اور ایسے حالات میں اسے پیرا دہرہ بددی کی آشد ضرورت تھی۔ وہ

بنیادی طور پر لائے گی کہ گوشہ نشین تھا کسی سختی سے وہ باطنی غماز میں رہتا اور اپنے کمرے میں کتابیں پڑھتا اور ان کے تعارف لکھنے میں مصروف رہتا اس کی خدمت اور اچھا کام بظہور کئے جوتے ہیں جس میں اس کی چھوٹی مورتی لٹلیاں درگزر کرتا رہتا تھا۔

گزشتہ برس، غالباً دسمبر کے مہینے میں وہ ایک صبح میرے کمرے میں آیا اور مجھے بتایا کہ اس کی مکتبی جو تھی ہے اور بدھدی اس کی شادی ہونے والی ہے۔ مجھے خوشی ہوئی اور میرا بھی تاہم نہیں لے اُسے نہایت گرم جوشی سے مبارکباد دی اور شادی کے بعد تنخواہ میں مستقل اضافے کا بھی وعدہ کیا۔ اُس کی منگنی اکثر اُس سے وہاں میں بھی لے لیا کرتی تھی ایک بار ایک بار ورنش نے مجھ سے تعارف بھی کر دیا تھا پہلی نظر ہی میں مجھے وہ لڑکی پسند آئی۔ میرا خیال تھا مرنش جیسے لائے گی شخص کو میری بیوی کی ضرورت تھی اس لڑکی میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں، بہت جلد مرش اور وہ ایک دوست کے بہت قریب آچکے تھے۔ مرش میں بہت ہلکے تھا، اب راس میں تھناؤ خاموش رہنے کی عادت تھی۔ ڈانٹک مزاجی اور نہ پہلے کی سی جھجک، بلکہ اُس کی آنکھوں میں ہمیشہ بڑی زندگی کی چمک عورت آئی تھی۔

میں نے بڑی جلد ہی جینی سے اپنی کمری میں بیوی بنا لیا۔ میں مرش کا تعارف اس کتاب سے اکثر کتاب بزرگ، لکھایا مکتوب ہے، لیکن شاید مرش میری بیوی بننا پسند کیا تھا، اُس نے دونوں ہاتھوں کو گھومتے ہوئے کہا۔ آپ یہ خیال نہ کریں کہ اس کتاب کا اصل مادہ سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ مزید واقعہ سن کر خود ہی فیصلہ کریں گے کہ کتاب بزرگ کا اس تمام واقعہ سے کتنا بگڑا تعلق ہے۔

اچھے دوستی کیلئے چار ماہ کے بعد مرش کی منگنی ہو کر واقعہ میں جاگ ہو گئی تھی اور تعارف مرش کو اپنی منگنی کی موت کا بہت صدمہ ہوا اس کے باوجود میں نے مرش کی آنکھوں میں کبھی آنسو نہ دیکھے تھے تاہم مرش پہلے سے بھی زیادہ خاموش ہو گیا تھا، ماضی کی تعقیبیت خود کر آئی، وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے پردوں کے سرے میں بیٹھا رہتا جتنا پتہ ہی ہفتوں میں اُس کے چہرے سے طویل چادری کے آثار نمایاں ہوتے گئے۔

اس کی روز بروز زندگی بڑھتی ہوئی صحت میں کچھ تفریش کا باعث بھی بننا نہیں لے لے کسی ڈاکٹر سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا۔ اس کے علاوہ ایک ماہ کی عرصہ دینے کا بھی وعدہ کیا، لیکن اُس نے کسات انکار کر دیا کہ وہ میری ذمہ داریاں ادا کرنا ضروری لازم نہ سمجھتا تھا کیونکہ حالات میں بیعتی میں اُسے دھڑکی سے جہاں دے دیتا، لیکن یہاں پر مرش کی وجہ کرتا اور اپنی دونوں مرش

سے مختلف موضوعات پر بڑی تفصیل سے گفتگو بھی جوتی میں سے مجھے امانان ہو کر باوقی غفلت اور کالے سر پہیے علوم کے مطالعے نے اُس کا ذہن بڑی طرح متاثر کیا ہے اور وہ دونوں کو پانے اور ان سے ہم کیم ہونے کے متعلق کچھ تجربے بھی کر چکا ہے۔ اُس نے گفتگو کے دوران باوقی غفلت علوم کے بارے میں میرا نظریہ بھی معلوم کرنا چاہا۔ دراصل ان طریقوں کے بارے میں مرش کا تحقیق مطالعہ اور دلچسپی اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ وہ اپنی منگنی کی زندگی کو جاکر اُس سے باتیں کرے کہ کتنی ہے اور اُسے اپنی کامیابی کا پورا یقین بھی ہے، اگرچہ مرش میں کے گھر سے مطالعے سے بہت متاثر ہوا تھا لیکن مجھے یہ سوچ کر بہت ڈگمگا کر ایک باطل اور بڑی شوشہ شخص پر راجہ و اس سب کا سوا سوار ہو چکا ہے۔

ان دنوں مرش کی حالت بڑی خراب تھی میں نے شربہ شادی کی ایک لائبریری سستے واس خریدی تھی، اس لائبریری میں کئی قسمی اور نادر نسخے موجود تھے۔ چند قلمی نسخے بھی تھے جو سو سو برس صدی کے دوران میں تصنیف کیے گئے اور سحر اور علم نجوم سے تعلق رکھتے تھے۔ میں نے آپ کو جو فرستے روز کی ہے اُس میں اس لائبریری کی طرف نصف گنتہ درج میں، لیکن میں جلد از جلد تمام کتابوں کی فرست اپنے پاس لے کر آیا ہوں گا کہ جو کچھ دینا چاہتا ہوں، میرا خیال ہے کہ مرش اس لائبریری کی طرف ایک کتابی کتابوں کی فرست اور تعارف تیار کر سکا تھا، باقی کام میں نے خود ہی کیا ہے۔ ادارے کے دوسرے آدمی ابھی اس قابل نہیں کہ کتابوں کی فرست اور ان کے جامع تعارف لکھ سکیں۔ یہ نہایت حق دہی کا کام ہے۔ آپ نے جو فرست پڑھی ہے، ان میں باوقی غفلت علوم کے بارے میں دوسری کتابوں کے علاوہ کتاب بزرگ، بھی درج ہے۔ یہی وہ فرست ہے جسے مرش کرتے ہوئے مرش نے غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ اُس نے دن رات ان کتابوں کا بغور تحقیق مطالعہ کیا تھا، اپنی منگنی کی موت کے بعد اُسے اس طرح دلچسپی اور غیر معمولی دلچسپی سے کام کرتے ہوئے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی اور مجھے پوری امید تھی کہ اب آہستہ آہستہ اپنی منگنی کی موت کا صدمہ بھول جائے گا اور پہلے کی طرح کام کرنے لگے گا۔

اس بات کو کہ ایک مہینہ گزرا کہ مرش وہاں بند ہونے سے چند روز پہلے میرے پاس آیا اور کتاب بزرگ کی قیمت پندرہ پانچ سو روپے ملے کہ وہ دی، مجھے یہ دیکھ کر میری بولی کیوں نہ کہ اُس میں کچھ کرنے کا شوق تھا۔ میں جانتا تھا کہ اپنی تنخواہ کے مطابق اُسے یہ جگہ شوق راس نہیں آسکتا چنانچہ

میں نے انکار کر دیا، سبب وہ یہ تھا کہ میں نے کتاب بزرگ کے صفحات اٹل ہاتھ کر خور سے دیکھے۔ یہ کتاب رگوں کو پانے کے متعلق یہودیوں کے قدیم عقائد اور طریقوں، افریقہ کے نئے قبیلوں کے رگوں کو پانے کے مختلف قبیلہ ہندوستانیوں، حضرت سلمان کے پرامر علوم وغیرہ سے ہمیشہ پڑی تھی۔ جو بزرگ مختلف ذرا چنے چنے جوتے تھے، درحقیقت رگوں کو پانے کے علم پر اب تک اتنی محنت اور محنت کتاب میری فکر سے گزری تھی، اس کتاب میں ہندو پڑھ کر مجھے اور جادو کے ذریعہ رگوں کو پانے کے کئی طریقے لاطینی زبان میں بھی درج تھے۔ اس قسم کی کچھ کتابیں میرے مطالعے سے گزری ہیں جس میں درج لاطینی زبان کے کئی طریقے کا جادو کر دے والے اکثر استعمال کرتے ہیں، چنانچہ میں نے کچھ سوچ کر یہ کتاب تجویز میں دے دی اور اس پر مزید خیال آرائی نہ کی۔

پندرہ دنوں کے بعد مرش نے مجھ سے تجویز کی چالی مانگی، مرش نااہل اعتماد آدمی تھا، تجویز کی چاہاں اکثر اس کے پاس ہی رہتی تھی، دراصل تجویز میں بہت کتابوں کے نسخے رکھے جاتے تھے، جب مرش ان کا تعارف لکھنا چاہتا تھا چاہاں مجھ سے لے جاتا تھا، میری دست میں مرش کو ان کتابوں کے تعارف لکھنا تھے، اس لیے میں نے اسے چاہاں لے دیں۔

تقریباً دو ماہ کاظم کو اکثر کچھ بچے کے قریب بند کرتے ہیں، میں سب ملاؤں کے ہاتھ کے بعد اور اکثر سات آٹھ بچے کے درمیان جاتا ہوں، میں مرش کے متعلق کچھ بچے پلے جاتے ہیں، لیکن مرش اکثر آدھ چوں گفتگو میری سے پہلی کیا کرتا تھا، اُس شام میں مصروف تھا، مجھے جس زبان کی ایک کتاب ہے پڑھنے لگ کر لکھ کر دیتے، لیکن تائشیں ہمارے باوجود مجھے منظور ہوا لے دھونے اور نقل کرنے میں غامضی و رنگ گئی، اُس وقت تقریباً ساڑھے سات بجے تھے، میرا خیال تھا کہ مرش چاہتا ہوگا، مجھے مرش کے ہاتھ لایا، اس کے کمرے کا دروازہ کھلے اور بڑے دروازے کے بند ہونے کی آواز سے چڑھ چلا جاتا تھا۔ دوکان کے درمیان طرف ایک بلب روشن تھا کہ اچانک مجھے پڑھوں کے نیچے واقع مرش کے کمرے سے ایک دھڑکنے لگتی دی، میرا خیال ہے میں نے زندگی میں اتنی دھڑکنیں کبھی نہیں سنی، یہ مرش کی آواز تھی، میں نے تیزی سے اپنے دفتر کا دروازہ کھولا اور بل کھائی ہوئی سیر میری سے

چپے جھانکا۔

بال میں روشن بلب کی بجلی سی روشنی میں میں نے ٹھنکی باندھ کر دیکھنے کی کوشش کی اور یہ دیکھ کر میرے دھڑکنے کھڑے ہو گئے کہ مرش کے کمرے میں تاریکی چھائی ہوئی ہے اور مرش و دروازے کا پینٹل گماتے میں مصروف ہے۔





خوف ناکہ کہانی

یانگ شہ

غیر ملکی ادب



کراچی

تہ تہ آباد کاسہ پہرانی دستہ کی تعمیر کے سلسلے میں ایک اہم ذمہ داری میرے سپرد تھی، کراچی سے تقریباً ۵۰ میل دور ہمارا کیمپ تھا، قریب قریب میں مزدوروں کی کچی کچی جوڑ پڑیاں اور منیکھڑاؤں کے نیچے نصب تھے، بزرگ کی تعمیر کی وجہ سے اس ویران اور غیر آباد علاقے میں بڑی چہل پہل ہو گئی تھی، بزرگ نکالنے میں سب سے دشوار مرحلہ راہ میں مائل جھونپڑی پہاڑیاں تھیں جنہیں کانٹے اور صاف کرنے کا کام جاری تھا۔

سردیوں کا موسم تھا، ایک شام میرے کیمپ پر تین مزدور آئے اور بڑی راہداری کے ساتھ گھنے لگے کھڑکے کے صاحب ہونے ان پہاڑیوں میں ایک بالکل ننگ و حلاکت آدمی دیکھا جس کا بدن شیشے کی طرح ہے یعنی اس کے سر کی ہڈیاں پیلایاں اور آنتیں وغیرہ صاف نظر آتی ہیں، چہلے تو میں اس بات کو نہیں دیکھتا کہ اس کا سر کیمپ میں ہی تھا اور وہیں اس نے مجھے بتائی تو میرے ذہن میں کسی زمانے کی پڑوسی ہوئی ایک کہانی تازہ ہو گئی۔

بہت عرصہ گزرا میں نے ڈاکٹر برٹ اسے جاننے کی رتب

درمیان بہت سے لوگ جمع ہوئے تھے۔ میرا ساتھ تھا، میں تیز قدم نکلتا ہوا وہاں پہنچا جھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا، میرے پندرہ سالہ بیٹے اور خاموش ساتھی کی کاش خون میں ات پت سرک پر پڑی تھی، اس کا جسم بڑی طرح کھلا گیا تھا، ایک پولیس ولس سے معلوم ہوا کہ وہ بگٹن مارا گیا ہوا سرک جو کر رہا تھا کہ تیز دنگر میں کے پٹنے کھلا گیا اور موقع پر ہی دم توڑ دیا، مرثیہ کا پوسٹ مارٹم اور تجزیہ و تحقیق تقریباً رات کے دس بجے مکمل ہوئی۔

تیس اپنے ساتھی کو اپنے ہاتھوں میں لے کر جب واپس ڈکان میں پہنچا تو میرا جسم کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا اور ذہن کی پورکیت ہو گئی اس کا آپ انتظارہ لگا سکتے ہیں، صرف چند گھنٹوں کے اندر کتنے حیران کن واقعے رونما ہو چکے تھے، میں اُن کے سر کی زرد روشنی میں برہم کی طرف دیکھتا ہوا آہستہ آہستہ مرثیہ کے کمرے کی طرف چل پڑا، یہ دیکھ کر میرا دل تیزی سے دم لگنے لگا کہ محض کتاب نمبر ۷۷ مرثیہ کی میز پر کھلی پڑی تھی اور قریب پرے

جو ستے پین پر پڑے زانچے بنے ہوئے تھے، ایک پلیٹہ و کافٹر ایک باقر بناتا جس کی تین انگلیاں نکلی ہوئی تھیں، میں نے پتے کے صفات کو آٹھ پٹ کر دیکھا تو میری پرانی کی حد زردی کو روحوں کو ہالٹے کے سلسلے میں مرثیہ کا سہ ہوا کی بہت سی منٹریں ملے کر چکا تھا۔

ابھی میں یہ کاغذات دیکھ رہا تھا کہ اُن کے سر میں دو تھوڑی کی لگی کچا چپ لٹائی دی نہیں تھی، یہ سب بزرگ، دل کمرے میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی، میں نے گاؤں کی طرف نظر دوڑائی، اچانک کھانک لگا، یہ گیارہ دیکھتے دیکھتے کی آواز میرے ذہن پر سمونے کی طرح پڑ رہی تھی۔

میں واپس کمرے میں آیا اور اُس محض کتاب کو آتش دان میں پھینک دیا، اگرچہ باقی الفطرت علوم پر ایک نادر نسخہ تھا، لیکن اس نے مجھ سے میرا بہت ملتی اور ذہن سامعین میں لا تھا، ایک ایسا ساتھی جس نے ایک خوب محنت سے لکھا تھا اور لکھنے کو بھی کام کی زیادتی کو محسوس نہ ہونے دیا، اس لیے اس نے کائنات کو دنیا ہی بہتر تھا۔

”میں جانتا ہوں مرثیہ کو آپ کو یقیناً ڈکھ چیتا ہوگا، لیکن میں نے سارا واقعہ و صحن بیان کر دیا ہے، اگرچہ چھرا سراد علوم کی کتابیں بے حد فنی بخش ہیں، لیکن آئندہ ایسی کتابیں لکھیں کہ شام میں بچہ زبانی لے گی، ایسی کتابیں جو انسان کی رفاقت و رہنمائی کے بھانے زندگی سے قرار کی تخریب کا ذریعہ ثابت ہوں۔“



اچانک اُس کے کمرے کا دروازہ کھٹک اور تیزی سے جھانکا ہوا ڈکان کے بڑے دروازے سے باہر نکلا، میں نے اُسے اواز دینا چاہتا تھا، لیکن الفاظ میرے منہ میں اٹک کر رہ گئے، اسی لمحے مرثیہ کے کمرے میں کسی کیسے کھٹکے کی اس زور سے آواز آئی کہ میں کانپ گیا، اچانک مرثیہ کے کمرے کا دروازہ زور سے کھٹک اور ایک سہ تیزی سے ہال کی طرف جاتا ہوا محسوس ہوا جو بڑے دروازے کے قریب جا کر نفوس سے دو چار ہو گیا، یہ سب کچھ جھپٹے میں ہوا میری کمر میں کچھ نہیں آ رہا تھا، میں اپنی جگہ سے حرکت کرنا چاہتی تھی آنکھوں سے دھند روشنی ہال کی ایک ایک پڑی ہوئی دیکھ رہا تھا کہ اچانک مجھے فضا میں غبار بھرتا ہوا نظر آیا، میری جگہ سے بدبو کا احساس ہوا، بو اتنی شدید تھی کہ سانس لینا بھی مشکل ہو رہا تھا، میری ریڑھ کی ہڈی میں خوف کے بارے میں سوچاں ہی رہ گئے تھیں۔

”ایسی مریو سے بچنے زندگی میں اتنے سال پہلے صرف ایک بار سا پڑا تھا، میں اُس وقت بچہ تھا، کسی نقش کش کے سلسلے میں، ہمارے گاؤں کے قبائلیں سے پولیس ایک دفن شدہ ویش کو نکالنے کے لیے آئی تھی، چند آدمی تو کمزور رہے تھے اور گاؤں کے بہت سے لوگ برساتان کی چار دیواری کے گرد کمرے پر منتظر دیکھ رہے تھے، ایک پولیس افسر نے سب لوگوں کو اپنے اپنے گھرانے کے لیے کہا، میرے لیے یہ پڑا دلچسپ معاملہ تھا، پہنچا تو میں پولیس والوں کی نفوس سے پہنچا ہوا ایک گھٹے درخت کے تنے کے پیچھے چھپ کر سارا منظر دیکھتا رہا، جب تاہم ناوٹ قبر سے نکالا گیا تو فضا میں اتنی شدید بو پھیل کر سانس لینا دوبارہ ہو گیا۔

”اس وقت ڈکان میں پھیلی ہوئی بو بالکل ایسی ہی تھی، اُس قدر نفس تھا کہ میرے دماغ کی کہیں تو گئیں اور پھر پر مجھ پر خودی طاری ہو گئی تھی، میں نے اپنے حواس کو جمع کیا اور واپس آکر کمرے میں بیٹھ گیا، کوسوں پر بیٹھا ہوا منٹ سوچتا رہا، مجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سب کچھ کس طرح اور کیوں ہوا، اچانک ذہن میں آیا کہ مرثیہ جھانک کر کہاں گیا ہوگا! میں نے اپنے دل کو سنبھالا اور آہستہ آہستہ بیڑیاں اُترتے دنگ ڈکان میں سناٹا تھا، مرثیہ کے کمرے کا دروازہ کھٹک تھا، بیڑیوں کے اختتام پر پہنچ کر میں نے مکمل کا سوچنا چاہا — میرا بچہ اپنی جگہوں کی قوی موجود تھی۔

نہیں تھی سے ڈکان سے باہر نکلا اور اصرار نہ کرنا، لیکن مرثیہ میں ڈکان کی زبانی مرثیہ کی رہائش قریبی علاقوں میں ہونے لگی تھی، میرا عقائد وہی ہے کہ گویا جو میں نے ڈکان کو تالا لگا دیا وہیں مرثیہ کی طرف چل پڑا، ابھی میں نے بمشکل آدھ ڈھنگ کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ کچھ دیکھتا ہوں کہ مرثیہ کے

کردہ ہیں سے متعلق، باوجود اکیس دکنی میں شفاف انسان کے متعلق پڑھا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ چین کے ایک شہر نیکی میں پسیدہ جو آن نام کا ایک ایسا آدمی تھا جس کا جسم شیشے کی مانند شفاف تھا وہ جب اپنا لباس اتار دیتا تو اس کا دل، جگر، پھیپھڑے، آنتیں، ہڈیاں اور پسلیاں حتیٰ کہ ذرا اور نظام ہضم کی گیند تک صاف نظر آتی تھی۔

پسیدہ بہر حال چین کا ایک اعلیٰ نظریہ یافتہ شخص تھا۔ اس نے چین کی اعلیٰ تعلیمی ڈگری، پوجن حاصل کی تھی اور ایک بڑے سرکاری عہدے پر فائز تھا اس کے جسم کی اس عجوبہ خصوصیت کو دیکھ کر بے شمار لوگ اس کے عہدیت مند ہو گئے تھے۔ ۱۵۴۲ء میں کی جرم کی پاداش میں اسے چنانچی کی مراد سے دی گئی لڑکچہ عہدہ مستقرین کنیوٹس کے احتجاج پر حکومت نے اسے بے قصور نسیم کر لیا اور اسے ایک بزرگ کا درجہ دے کر اس کے سبب میں اس کے نام کی ایک نئی لگوا دی۔

اس کا نام کیسے یاد آئے ہیں، نے فرزدو دل سے ہر ذرات کی جگہ اور مجھے یقین ہو گیا کہ ان پہاڑوں میں شفاف جسم کا انسان ہیثیتا موجود ہے۔ اس شفاف انسان سے ملاقات کا اشتاق بڑھ چکا تھا لہذا میں شام ہوتے ہی اپنا پستول لگا کر قرب وجوار کی پہاڑوں پر اس کی تلاش میں نکل گیا۔ مگر وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ اب میرا ہر شام یہ معمول بن گیا تھا کہ کام سے فارغ ہو کر شفاف انسان کی تلاش میں نکل جاتا اور گھنٹوں مگر گراں رہتا مگر انفس پانچ چھ روز کی تلاش میں تب سب کچھ یاد آئی اور میں نا امید رہا ہوا۔

پھر ایک شام پانچ بجے میری اندیر برآتی تھی۔ میں نے اسے بہت زور دیا کہ میری پہاڑی پر کھڑے دیکھا دانی اس کا جسم شیشے کی طرح صاف شفاف تھا۔ میں اس پہاڑی کی طرف تیزی سے دوڑا مگر میرے پاؤں پٹختے پٹختے دوچلا دے کی طرف قاب ہو گیا۔ شام کا اندیر اتنی تیزی سے پھیل رہا تھا کہ اسے میں نا کام ٹوٹ آیا۔ دوسرے دو زچار بجے ہی میں اس پہاڑی پر اس عجیب و غریب انسان کو تلاش

کرنے کی غرض سے پہنچ گیا۔ میری جیس جی نگاہیں پہاڑی پہ کھڑے کھڑے کئی میل کی حدود کا جائزہ لے رہی تھیں مگر آج بھی شام کا چھٹا بجی آہستہ آہستہ اندیر سے میں تبدیل ہونے لگا۔ اور مجھے ایک باہر پائوس واپس آنا پڑا۔

وقت گزرتا رہا اور اس کے ساتھ ساتھ میرا شوق ملانٹا بڑھتا چلا گیا۔ ایک رات کا ذکر ہے میں اپنے نیچے میں صبا عادت مطالعے میں مبتک تھا کہ دفعہ باہر کی کے پرارار قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس غیر متوقع آہٹ پر میرے کان کھڑے ہوئے میں نے احتیاطاً پستول نکالنے کے نیچے سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ چند لمحے بعد نیچے کے دروازے پر جسے رات کو سمجھنے لگا کہ بند کر دیا جاتا تھا، آہستہ سے دستک ہوتی۔ میں نے انتہائی رعب و آواز میں لوک کر پوچھا: کون ہے؟ باہر سے ایک شخصیت آواز سنائی دی۔

میں آپ سے ملنے آیا ہوں۔ شفاف انسان.....

مجھے کئی روز سے آپ تلاش کرتے رہے ہیں؟

شفاف انسان: آج خود ہی مجھے ملنے آ گیا تھا۔ میرے دل میں خوشی کی ایک لہر تھی مگر دوسرے ہی لمحے خوف و ہشت میں بدل گئی تھی۔ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کیا جواب دوں کہ ایک لمحے کے بعد وہ میرے نیچے کے اندر میری آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ بالکل برہنہ تھا۔ ماہرے دہشت کے پستول میرے ہاتھ کی گرفت سے نکل کر زمین پر گر پڑا۔ خوف کی سرولہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ کس لیب کی تیز دھن میں اس کے شفاف جسم کے اندر ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی۔ میں بھی پہلی نظروں سے اسے مسلسل دیکھ جا رہا تھا۔ اس کے پیسے پر بڑی مصوصیت تھی۔ پورا جسم مند تھا اور کسی قسم کی وحشت یا خوف نہ تھی۔ ان چند منٹوں میں میں نے کئی بار اپنی تمام ذوقیں متع کرتے ہوئے اس سے گفتگو کرنے کی کوشش کی مگر انداز میں حق سے نکل نکلی۔ میرے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے میری ساری قوتیں سلب کر لی ہوں۔

کیا پیدائش کے وقت ہی سے تہا راجم شیشے کی مانند شفاف تھا۔ میں نے دریافت کیا۔

منہیں پیدائش کے وقت میں بالکل عام انسانوں کی طرح تھا۔

وہ کہتے کہتے رک گیا، اس کے پیسے پر گھبراہٹ اور وحشت ہی طاری ہو گئی۔ چند لمحوں کے بعد خود ہی بولا: یہی وہ راز ہے جو تین سو اٹھادس سال سے میرے سینے میں دفن ہے۔ لیکن اب میں شاک گیا ہوں۔ اتنی طویل مدت تک زندہ رہنے کے بعد اب میرے دل میں صرف ایک ہی خواہش اور ایک ہی شکا پھیل رہی ہے کہ موت کی پرسکون آغوش میں سوا دس عطر میری یہ خواہش اسی وقت پوری ہو سکتی ہے کہ وہ راز جو صدیوں سے میرے سینے میں دفن ہے اس میں کسی کو ہرگز نہ مل سکے۔ میں بہت غصا اس کی انگلیوں پر دھکا دے رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا:

نظر بننا چار سو سال قبل جبکہ میری عمر ۲۷ سال کی قریب تھی۔ میں اپنے ملک میں ایک بڑے سرکاری عہدے پر فائز تھا۔ کہتے ہیں کہ جوانی بولانی ہوتی ہے۔ اس دوا لگی نے مجھے بھی اپنا شمار بنایا لیا اور مجھے اپنے شہر کی ایک عین و جیل ڈھونڈنے سے بہار ہو گیا۔

میری محبوبہ کا نام: یانگ تھی۔ تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے دایہا زمت کرتے تھے وہ چہرہ تیار تھی اور میں بھی اس پر فخر۔ ہماری پاک محبت وقت سے بے نیاز پروان چڑھتی رہی۔ آخر ہم دونوں نے ازدواجی رشتے میں منشاگ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک دن میں یانگ تھی کے والد کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا مذا بیان کیا۔ میرا مدعا اس کا اس کا باپ آبدیدہ ہو گیا اور بڑے دکھ کے ساتھ کہا: بیوان میں تم سے اچھی طرح واقف ہوں۔ تمہاری شرافت کی میرے ماہر بڑی قدر ہے۔ یقین کرو اگر میں: یانگ تھی کی شادی کر سکتا تو پورے

بڑی مشکل سے میں نے اپنی قوت ارادی سے کام لیتے ہوئے اپنے حواس مجتمع کیے اور اس سے بچا کہ تم مجھے کسی مقصد سے ملنے آئے ہو۔ وہ بڑے نرم لہجے میں بولا کہ مجھے اس بات کا علم ہے کہ آپ کئی روز سے مجھ سے ملنے کی کوشش کر رہے ہیں لہذا آج میں خود ہی آپ سے ملنے چلا آیا دینے بھی مجھے آج آپ کے پاس آنا ہی تھا کیونکہ آج میں اپنی زندگی کا ایک اہم راز افشا کرنا چاہتا ہوں۔ اتنی دیر میں میرے جوش و حواس بھی بجا ہو چکے تھے۔ میں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا:

مجھے تمہارے متعلق تفصیلات معلوم کر کے خوشی ہوگی آرام سے بیٹھ کر اپنی داستان یا وہ اہم راز سن کر ذکر کر رہے ہو۔ سناؤ: میرا شکر یہ ادا کر کے وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے وہ بالکل خاموشی سے بٹھکتا ہے کچھ سوچتا رہا پھر اس نے میری طرف دیکھا اور بولا:

میں یہاں تین سو اٹھادس سال سے موجود ہوں:

تین سو اٹھادس سال سے؟ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا: یہ تو کہہ رہا ہے جو: کیا کوئی انسان اس زمانے میں تین سو اٹھادس سال تک زندہ رہ سکتا ہے؟

اس نے میری حیرت پر کئی توجہ زد دی اور بڑی سنجیدگی کے ساتھ بولا: ویسے اس وقت میری عمر چار سو اٹھائیس برس ہے۔ ۱۵۴۲ء میں حکومت چین نے مجھے ایک ناگرد گناہ کی پاداش میں جہانچی کی مراد سے دی تھی۔ اس وقت میری عمر تیس سال تھی۔ میں مریت اور خوف اس کی طرف دیکھ رہا تھا ایک بار پھر میں نے اپنے اوپر دہشت طاری ہوتے ہوئے محسوس کی۔ وہ بولا: چین کی حکومت اور عوام کی نظروں میں میں چرچا ہوں لیکن درحقیقت میں زندہ ہوں اور تین سو اٹھادس سال سے اس کو برا لے کر اپنا مسکن بناتے ہوئے ہوں۔ تو کیا تمہارا نام: پسیدہ جوآن ہے؟ میں نے پوچھا:

جی ہاں آپ کو میرا صحیح نام معلوم ہے۔ مگر میں آپ کی اس معلومات پر حیرت کا اظہار نہیں کر دوں گا کیونکہ اس معلومات کی بنا پر

ی آپ مجھے تلاش کرتے تھے:

ملک میں موت تم ہی وہ پہلے اور آخری انسان ہوتے جن کے ہاتھ میں اپنی پیاری بیٹی کا ہاتھ دینے میں میں جتنی خوشی محسوس کرتا مگر محسوس یہ تھا وہی محسوس نہیں ہو سکتی میں مجبور ہوں۔

میں نے زندگی میں موت ایک ہی بار قسم کھائی ہے اور اپنی اس قسم کو کسی بھی قیمت پر توڑنا نہیں چاہتا۔ میں اپنی آنکھوں سے اپنی جوان بیٹی کی زندگی برباد ہوتے دیکھتا ہوں گا مگر کبھی قسم نہ توڑوں گا۔

میں دیکھی دل کے ساتھ یا نگ شہی کے باپ کی بات سن رہا تھا۔ وہ بزرگ خود بڑا زنجیر تھا۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ ایسی کیا قسم ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی بیٹی کو عمر بھر کنواری رکھنے پر مجبور ہے مگر پھر اس کے کہیں کچھ پوچھتا اس نے خود ہی اپنی قسم اور اس کا حیرت انگیز سبب مجھے بتا دیا۔ اس نے کہا جب یا نگ شہی صحت دوبارہ مٹی میں پورے نازان کے ساتھ دریائے یا نگ شہی میں ایک کشتی کے ذریعہ سفر کر رہا تھا کہ یکایک کشتی الٹ گئی۔ بڑی حد وجہ اس کے بعد اس سال پرچا سیے گئے گھری مٹی کو دب گئی۔

بچے کے لم میں اس کی ماں بچاڑیں گھاس رہی تھی اس وقت تک مجھے نے کچھ کا کوئی نام بھی نہیں رکھا تھا کیونکہ شوق ملازم گھنٹوں میری بھیگی لاش تلاش کرتے رہے مگر وہ نہ ملے تو اس کی ماں نے میرے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں زندگی بھر اس دریا کے کنارے بیٹھ کر اپنی بچی کا انتظار کروں گی۔ اس کی اس دیوانگی سے مجبور ہو کر میں دریا سے مخاطب ہوا اور کہا کہ اسے دریا نے یا نگ شہی آپ میری بچی کو زندہ سلامت واپس کر دیجئے میں اس کا نام آپ ہی کے نام پر رکھ دوں گا میرا دل بھڑھڑاتے ہوئے سے پہلے ہی میری بیوی نے کہا اچھے دریا سے یا نگ شہی ہم اپنی بچی کا بیاہ بھی آپ ہی کے ساتھ کر دیں گے۔ میں نے اس کی تائید کی اور مزید کہا کہ اسے دریا سے یا نگ شہی ہی قسم کھاتا ہوں کہ یہ وہ دونوں وقت ہم ضرور پورا کریں گے۔ آپ ہماری یا نگ شہی کو زندہ سلامت واپس کر دیجئے۔ بیرواں شاید یقین نہ کرو بیٹا! اور یا میں بڑے

دور کا کتا کلم پیدا ہوا اور چند ہی لمحوں کے بعد اونچی اونچی موجوں پر ہماری بچی جتنی کھینچی آئی نظر آئی اور دوسرے ہی لمحے موجوں نے ہماری بچی کو ہمارے قدموں میں لاکر ڈال دیا۔ ہماری خوشی کی انتہاء تھی۔ ماں نے پک پک کر اپنی محنت جھگڑا کھانا دیا اور ہم نے ایک بار پھر اپنے ویڑتاؤں کو حاضر و ناظر جان کر دیا سے کیے ہوئے دھسے کو ڈھیرایا اور پڑی خوشی واپس آگئے۔

یا نگ شہی کے باپ کے منہ سے یہ باتیں سن کر میں مایوس و نامراد واپس آگیا۔ ان واقعات کو سننے کے بعد اب کچھ کبنا غمنا محض طاقت تھی۔ میرے ساتھ ساتھ خود یا نگ شہی نے بھی پہلی بار یہ ماز اپنے باپ کی زبان سے سنا تھا اس پر تو مسکے طاری ہو چکا تھا۔ دوسرے روز جب یا نگ شہی مجھے ملنے آئی تو بے حد پریشان اور نڈھال تھی۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ یا نگ شہی اس قسم کی وجہ سے ہمارے والدین واقعی مجبور ہیں۔ وہ کسی قیمت پر اپنی قسم نہیں توڑیں گے لہذا ہمیں یہ راہ نکال سکتے ہیں کہ کسی دوسرے ملک چلے جائیں اور وہاں ہمارے شادی کر لیں۔ مگر یا نگ شہی خود بھی بڑی مذہبی تھی کہ لڑکی تھی اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ میں اپنے والدین کے امتداد کو نہیں چھوڑ سکتی۔ میں ساری زندگی کو بھی تڑپ تڑپ کر لگتا رہوں گی۔ اپنے ہاتھوں اپنے جذبات کا گام گھنٹ ڈول کی مگر قسم توڑنے کا پاب نہ کر رہی گی۔

پھر کچھ عرصہ ہم معمول کے مطابق ملتے رہے مگر اس انکشاف کے بعد وہ یا نگ شہی جو پہلے ہر وقت جتنی مسکراتی رہتی تھی۔ بالکل چرمود ہو کر رہ گئی۔ اس کی ساری انگلیں۔ انگوٹھیں اور ہاتھیں ہر جگہ جمتیں چنہاں ان ہی اذیت ناک حالات میں گر گئے۔

پھر ایک روز یا نگ شہی نے مجھے ایک عجیب و غریب بات کہی جسے سن کر میں لرز اٹھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ کل رات اسے خواب میں دیا سے یا نگ شہی ایک ویڑتا کے روپ میں نظر آتے اور کہنے لگے کہ یا نگ شہی ہم قسم سے اور تبار سے والدین سے بہت خوش ہیں کہ انہیں اپنے دھسے کا احساس ہے۔ لہذا ہم تباری

جوانی اور جوانی کے ساتھ زندگی کو بھی امر بناتے ہیں اور نہ صرف تباری بلکہ تم سے محبت کرنے والے بیرواں کو بھی طویل زندگی بخشنے ہیں لیکن اس کے لیے تمہیں ایک بار موت کا کھیل کھیلنا ہوگا اور اس کھیل میں بیرواں کو زندہ بننا ہوگا۔ ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں کہ اس پر سے کھیل میں تمہیں ڈیڑھ بجے تک صلیب نہ ہوگی۔ بیرواں سے کہو کہ وہ تبارا نر خراجہ کہ تبار سے ہم کا خون پی لے۔ اس طرح تم دونوں امر بن جاؤ گے۔

بیرواں نے بات کہتے کہتے خودی لرز رہا گیا تھا اور میں تو دماغ خوف کے مارے کا پتہ نہ تھا مگر محنت کیے بیٹھا رہا۔ بیرواں نے پھر کبنا شروع کیا۔

میں نے یا نگ شہی کو اس خوفناک ارادے سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ہر طرح سمجھایا، اپنی محبت اور اس کی زندگی کے واسطے دینے۔ محنت، محبت کی، مگر وہ کبھی نہ مانا اور برابر امر کر رہی رہی کہ اگر واقعی تمہیں مجھ سے محبت ہے تو دو دو تار کے خیران کو لہو کر دو۔ یہ کوشش کئی دن جاری رہی۔ جب میں ہر طرح مجبور ہو گیا تو اس خوفناک کام پر آمادہ ہو گیا۔ اور اسے اپنے گھر کے تہ خانے میں لے گیا پھر دھسے کو اس طرح غیر اختیاری طور سے کھاتے ہوئے یا نگ شہی خوفناک درد کی سدا ہو گئی کہ میں نے آٹا قانا اس کا نر خراجہ چا ڈالا۔

اس کے ملنے سے گرم گرم خون کا فوارہ اُبل پڑا جسے میں نے اپنے منہ میں لے لیا۔ یہ ایک ناقابل یقین سی بات ہے مگر یا نگ شہی کو اس طرح مرنے میں ذرا برابر میری صلیب نہ ہوئی۔ نہ وہ جی نہ مانا بالکل خاموشی کے ساتھ انتہائی محبت میرے انداز میں میری گرفت میں ایسی رہی۔ میں اس کا گلہا جانا اور خون پتا رہا۔ وہ عالم نرس میں مجھے ٹھکر میری لگا ہوں سے دیکھتی رہی۔ اپنے غم سے غم سے انھیں مے گلوں پر چیرتی رہی۔ ایسا محسوس ہوا کہ تھا مجھے اسے بہانے صلیب کے بڑی راحت اور سکون مل رہا ہے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ غم سے جھوٹی ہو گئی۔ اور میں گھنٹوں اس کی کرد لاش سے چٹا ہوا روتا رہا۔ میں نے تہ خانے ہی میں اس کی لاش کو بڑی محنت و احتیاط

سے دفن کر دیا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ خون پینے کی وجہ سے میرے اندر بیک وقت کئی انسانوں کی طاقت پیدا ہو گئی ہے۔ یا نگ شہی کی تہیض کے بعد میں نے غسل کیا اور کمرے کے کونے پر کھڑے ہوا۔ میرے حواس بالکل بھٹکتے تھے کہ کڑا یاغوت نہ تھا اور سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ مجھے اپنے اس کرد و عمل کا یا نگ شہی کی جوانی کا دنا برابر سچ نہ تھا بلکہ جیسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے گشت کو اپنی ملکیت بنا کر میں اپنے گھر کے تہ خانے میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر گیا ہوں۔ یا نگ شہی کے خون نے مجھے اس وقت ایسا سکون دیا کہ وہ ضرور بھٹکتا تھا جو نہ اس سے پہلے کسی ماحصل ہوا تھا اور نہ ہی اس کے بعد۔ میں کافی روز تک چل قدمی کرنے کے بعد تو کھانا میرے دل میں خود بخود پھر احساس پیدا ہوا کہ اپنی بوجہ کے لیے چھوٹی ہی لیتا چلوں۔ میں نے خوش ہو کر کھانا کھانے کے بعد کچھ تہ خانے سے تہ خانے پر گھر آکر سیدھا تہ خانے میں چلا گیا۔ کچھ چھوٹی چٹا کر میں اس کی قبر سے چھٹ گیا۔

یقیناً میں مجھے بالکل بول محسوس ہوا تھا جیسے وہ میری آغوش میں زندہ سلامت لپٹی ہوئی ہے۔ پھر اسی عالم میں میں سو گیا۔ خواب میں یا نگ شہی اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ نمودار ہوئی۔ اس نے میرا گھر پر آدیا۔ وہ آج کل کے حد خوش اور مطمئن تھی۔ وہ تو بصورت تو کبھی ہی مگر اس وقت وہ اور بھی زیادہ حسین نظر آرہی تھی۔ صبح جب میں بیدار ہوا تو بالکل ہشاش بشاش رہا۔ پوری رات یا نگ شہی کی آغوش میں گزارنے کا احساس دل و دماغ میں تازہ تھا۔ اس کی صلیب اور گرم آغوش کا سرور جو کاتوں غما تھا۔ دوسرے روز صبح جب میں نہانے کے لیے غسل خانے گیا اور لباس اتارنا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں نے اپنے آپ کو اسی عالم میں پایا جیسا کہ آپ مجھے اس وقت دیکھ رہے ہیں مگر خبر کرسی قسم کا کڑا یاغوت طاری نہ ہوا۔ میں نے اطمینان سے غسل کیا۔ کپڑے پہنے اور اس تبدیلی کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے حسب معمول اپنے پسندیدہ ریشم ٹیٹ میں ناشتہ کے لیے چلا گیا۔

• دیوتا تہیں معاف کریں ہیران۔ ہیرا
یا نگ شہنشاہ کے گناہ کی سزا مل رہی ہے۔
تہا میں طاقتور زمین سے اسٹارک پاتال میں بھیجی۔
جاری ہوں...

• نہیں نہیں۔ میں جیسا۔۔۔ یا نگ شہنشاہ ایسا
کبھی نہ ہونے دوں گا۔۔۔ میں دیوتاؤں سے خود مافی
مانگ لوں گا۔ جیسا کہ تہا سے ساتھ دیوتا کے حضور چلتا ہوں۔
• مگر میری ان بد نصیب آنکھوں کے سامنے میری پیاری
یا نگ شہنشاہ دیکھتے ہیں ایک رقیب ہاؤس کی شکل میں ہر گز اور
میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ میری ایک دماغی غلطی کی اتنی بڑی سزا ہے
آنا فنا دوسے دیوتا۔

• ہیران خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے
تھے۔ اس المناک کہانی کے انہما پر میری اپنی آنکھیں ڈب ڈبائی تھیں
میں سر ہٹا کر اس خوفناک آپہتی پر غور کر رہا تھا کہ کیا ایک میری
نظر میں آنکھیں اور میں یہ دیکھ کر کسب کیا کر سکتا ہوں؟
• ہیران کا شہنشاہ ہر رقیب ہاؤس کی شکل میں زمین پر سر ہٹا رہے
خوف و دہشت سے ہیں لرزنا تھا اور میں اپنے سینے سے ہاتھ رخل
بھاگا۔ جیسے سے ہاتھ رکنے کے چند منٹ بعد جب میرے حواس
کسی قدر درست ہوئے تو مجھے احساس ہوا کہ صحت عادی کے
آثار غور و فکر پر ہیں۔

• اس لرزہ خیز کہانی کا ایک ایک حرف میرے ذہن میں تازہ
تھا۔ جب صبح کی روشنی پھیلی تو میں بڑی ہمت کر کے اپنے خیمے
کے اندر گیا۔ اٹھ کھڑا کر کے قریب ہیران کا سر رقیب ہاؤس
کی شکل میں پھیلا ہوا تھا۔ مجھ پر اب تک ایک لرزہ ماحول تھا۔
میں نے اپنا خیر دیاں سے اٹھا کر کافی دور نصب کر لیا۔ اس
واقعہ کو گو گو کافی عرصہ گزر چکا ہے مگر کبھی جب مجھے یہ داستان
یاد آتی ہے تو میری دُور تک لرزہ کر رہ جاتی ہے۔



• کسی پر بظاہر کہ دوں گا تو موت مجھے اپنی آغوش میں لے لے گی۔
• ایک روز میں یا نگ شہنشاہ کے اظہار میں ایک بہاؤی کے
دامن میں بیٹھا تھا کہ مجھ کا سا خوبصورت ہرن کا بچہ اچھلتا ہوا میرے
قریب آ گیا۔ میں نے ایک ہی جھپٹے میں اسے بچھڑا دیا۔ وہ میرے
ہاتھوں میں بڑی طرح چھلکا رہا مگر مجھے اس وقت شدت کی
بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے نئے نئے خوبصورت
بچے کا گلچا ڈالا اور اس کا گرم گرم خون پی لیا۔ ابھی میں اس کا
خون پی ہی رہا تھا کہ فضا میں ایک عجیب قسم کی لرزہ خیز گونگواہٹ
ہوئی۔ ساری فضا لرزنا لگی اور مجھے یا نگ شہنشاہ کی آواز سنانی دی وہ
برص و درداک جیسے میں جتنی بڑی تھی۔ ہیران۔ ہیران۔ یہ
تم نے کیا کیا۔۔۔ ہیران یہ نہیں کیا ہو گیا؟ یہ تم نے کیا کر دیا؟
• میں نے جواب دیا ہوتے ہوتے ہرن کے بچے کو لاہو چھڑوایا اور
کھڑا ہو کر دھڑلے دھڑلے لگا۔ فضا میں ایک گہرا غبار سا اٹھنا اور میرے
خوابوں کی نگاہ یا نگ شہنشاہ پریشان حال میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس
نے بڑی دھڑلے نظر سے میری طرف دیکھا۔ اس کی طرف دوڑا۔
• خبردار ہیران، اب میرے قریب نہ آنا، آف ہیران آف
تم نے میری محبت کا گلا دھڑی اپنے ہاتھوں سے گھونٹ ڈالا ہے۔
اس نے کہا بہتیں تو موت پر بندوں کے خون اور گوشت کی اجازت
تھی یہ تم نے ہرن کے بچے کو کیوں چا ڈالا؟ تم دیوتاؤں کی نصیحت
کو کیوں بھول گئے...؟

• اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور میں واقعی گہرا گھبراہٹ
یا نگ شہنشاہ نے رفت بھری آواز میں کہا: تہا ہی اس غلطی پر درپائے
یا نگ شہنشاہ کے دیوتا کو مضر آگیا ہے۔ اس نے ہی پر طوفان مینما
ہے اور اسی نے اس طوفان میں مجھے صدمہ کر ڈالنے کا حکم دیا ہے۔
میں اب مراؤں گی ہیران۔۔۔ تم نے خود ہی مجھے مار ڈالا
ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے چوڑے کی کوشش کی مگر وہ میری
گرفت میں آئے سے قبل ہی دور جاگ گئی اور بڑی کمرور آواز
میں لا کھڑے ہوئے بولی:

• کچھ عرصے بعد حکومت نے مجھ پر ایک باطل جہاد اعلان کر دیا
کر لیا۔ اس وجہ سے میں بھی لوگوں کو میرے شہنشاہ کے متعلق کسی نہ
کسی طرح غلط فہم چکا تھا۔ البتہ آہستہ آہستہ بہت سے لوگ مجھے دیوتا
کا اوتار سمجھ کر میری بڑی عزت کرنے لگے سینکڑوں عقیدت مندوں
نے میرے مقصد کے لیے ہر دی میں حصہ لیا، مگر ان کی ایک دہلی اور
مجھے چھانی کی سزا سادی تھی۔

• چھانی کی سزا میں صرف چند گھنٹے باقی رہ گئے تھے کہ کیا ایک
جیل کی تنگ دھاریک کو غرض میں میری یا نگ شہنشاہ آئی۔ وہ آج صبح
سے زیادہ خوش نظر آ رہی تھی۔ اس نے مجھے بڑے پیار سے گلایا۔
اور بولی۔ پیارے ہیران! آج صبح حکام علی بظاہر تہیں چھانی
کی سزا دے دیں گے مگر تم خوف زدہ نہ ہونا میرے اچھے دیوتا
تم بالکل نہ گھڑانا۔ چھانی کے تختے سے آ کر کہہ میں تہیں یہاں سے
دور۔ بہت دور سے تلوں کی جہاں ہم اور تم قیامت تک
پوری آزادی سے ملتے رہیں گے اور محبت کے لازوال اگیت
الاپتے رہیں گے اور اس روز سے آج تک میں آپ کی اس زمین
پر ان پہاڑوں میں زندگی گزار رہا ہوں۔ میری یا نگ شہنشاہ میرے
میرے ساتھ رہتی ہے۔ وہ ہر وقت میری دُور کی طرف ہے۔ مجھے
اس کے پہلو میں بڑا سکون اور آرام ملتا رہا ہے مگر اب۔۔۔ مگر اب
ہیران کہتے کہتے رک گیا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں سے غم نے
موسے آنسو نکل پڑے۔

• میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا: مگر اب کیا ہیران ہیران
تم ہیران کیوں ہو گئے؟ تم تو بڑی ہمت اور حصے والے انسان
ہو۔۔۔ اس پوری داستان میں ہر گز تہا را حوصلہ اور ہمت ہی تو
کا رہنا ہے۔

• وہ میری بات سن کر رولا: ہاں جناب۔ میں اپنی محبوبہ کے
ساتھ اس حالت میں قیامت تک بھی رہتا تو مجھے تکلیف نہ ہوتی۔
مگر اب میں زندہ نہیں رہنا چاہتا اور اسی لیے اس راز کو ظاہر کر
رہا ہوں کیونکہ یا نگ شہنشاہ کے کہنے کے مطابق میں جب میں یہ دلا

• میرے لیے لطیف و لذیذ ناشتہ لاکر میرے سامنے رکھا۔
میں نے ایک لٹر اٹھا لیا مگر مزہ میں لے جا نہ سکا۔ ہاتھ کا لٹریٹ
میں رکھ کر کاؤنٹر پر آیا۔ بل اوا کیا اور دفتر روانہ ہو گیا۔ ہیران کے
مطابق تمام وقت اپنا فرض منصبی انجام دیتا رہا۔ سارا دن دیکھ کھایا
نہ پایا اور بڑی کوئی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔

• اس رات میں پھر اپنی یا نگ شہنشاہ کے نزدیک سے جا بٹھا اور خود ہی
ہی دیر بعد پر سکون گہری نیند سو گیا۔ وہ صبح کی طرح آج بھی اپنے
قیامت خیز شہنشاہ کے ساتھ مجھے خواب میں ملی۔ وہ میرے شہنشاہ
جسم کو دیکھ کر رنار ہوئی جاری تھی۔ وہ میرا جسم بار بار خوشی اور خوش
ہوئی تھی پھر جاتے جاتے کہنے کی میرے اچھے ہیران تم آج
سارا دن دیکھ کھا کے نہ بی بی کیسے ہو۔ مگر تم اس کی فکر نہ کرنا۔
دیوتاؤں سے نہیں کھانے پینے کی غلت سے پاک کر دیا ہے۔
اول تو بہتیں بھوکے گئے گی یہ نہیں لیکن اگر کسی محسوس ہو جی تو تم
صرف پرندوں کا خون پی سکتے اور کچا گوشت کھا سکتے ہو۔ تم امر
بنا دیتے گئے۔۔۔ تم اس وقت تک نہ مرنے دو گے جب تک کہ
تم خود ہی میری موت کا کارڈ کسی پرافتا کر دو۔ میرا اور تہا را ہر رشتہ
اس وقت تک قائم رہے گا جب تک تم پرندوں کے خون اور گوشت
کے سوا کوئی دوسری چیز استعمال نہ کرو گے۔ ہیران یہ لرزہ خیز داستان
بلانلان منانے چلا جا رہا تھا۔ میں نے کہا: ہیران اس دہشت انگیز کہانی کو
ٹھٹھٹھٹھ کرنا چھوڑنا۔ اس وقت بھی میرے بدن میں یہ خوفناک
داستان سننے کی وجہ سے گھٹی گھٹی لگی تھی۔ ہیران چند لمحوں
پھر رولا:

• یا نگ شہنشاہ کے غامضانہ والوں کو اس کی گشت گئی سے مجھ پر دوا
سامی تنگ و جزا میں ہوتا تھا مگر بارہو اس کے والد سے ملنے
گیا گا بنوں نے مجھ کو کسی قسم کے شک و شبہ کا کبھی اظہار نہیں کیا اس
نام میں ایک سال گذر گیا۔ میں کبھی کسی دفتر سے والہی پر کچھ پڑے
خبر نہ لانا اور رات کو یا نگ شہنشاہ کے دروازے پاس بیٹھ کر انہیں کچا کھا
ماتا تھا۔ کبھی کسی صبح ان کا خون پی کر باقی گوشت چھید کر دیا کرتا۔

میرا نام سننے والا بھٹا ہے کہ کسی گورے
مجھے غیر کر دیا ہوگا۔ ماں بڑا ماتر
مجھے ایک گورے ہی نے تھا مگر وہ ولایتی نہیں، دیسی
گورا تھا رنگ روپ اُس کا انگریزوں کا ساتھ اس
بچے وہ گورا مشہور ہوا۔ اس خاندان کے غیر معمولی گورے
رنگ کی وجہ اُن کا کہیں الاصل چونا تھا اُن کے آباد اجداد
جوہین کے عمیری قبیلے سے تھے کسی زمانے میں
سے ہجرت کر کے بڑ مغ میں گھومنے لگے تھے یہاں اُن
لے تھے۔

برہنہ کا گر کھلا دیا اور اُس نے ایک چکرے بچے کی صورت اختیار کر لی۔

میاں فضل دین دوبرہ اور شام کا کھانا کھڑے ہیں کھایا کرتے تھے، بکری کوئی نہ کھتی مہمان موجود ہوتا تھا اور جب ایسا نہ ہوتا تو گھر پر کھانا کھاتے۔ یہ چکرہ بلا ہمیشہ اُن کے دسترخوان پر بیٹھا تھا۔ اُس کے لیے یہاں اور گھر میں علیحدہ طشتری کا انتظام تھا۔ میاں صاحب کھانے کے لیے جب باقاعدہ دھوئے تو وہ بھی نل پر باقاعدہ اپنا منہ اور ہنچے دھوا اور اُن کے ساتھ دسترخوان پر اپنی جگہ اُن بیٹھا۔ نوکر اُس کی طشتری نکالتا۔ میاں صاحب پہلا نوالہ شور بے میں بھگو کر اُس کی طشتری میں ڈالتے اور دوسرا نوالہ خود لیتے اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا۔ انکے بلا سیر ہو جاتا اور طشتری سے انکے ہٹ جانا اگر کبھی ایسا ہوتا کہ وہ نوالہ ڈالنا قبول جاتے اور اُسے بھوک ابھی باقی ہوتی تو وہ نیچے سے اُن کا دامن آہستہ سے کھینچتا اور وہ مسکراتے ڈال دیتے۔ کھانے کے بعد میاں صاحب کے ساتھ نل پر جا کر نیچے اور منہ پانی میں ڈبو کر صاف کرتا۔ رات میاں صاحب جب یہاں سے گھر جاتے تو پکا ایک چوب دار کی طرح اُن کے آگے آگے دوڑتا جیلا مہانا اور یہ علامت ہوتی کہ وہ گھر آ رہے ہیں۔ انہیں گھر پہنچا کر وہ رات بھر کے لیے غائب ہو جاتا اور ناشتے پر اُن موجود ہونا جب میاں صاحب اپنے رُوتی کے کارخانے تک جہرہ گئے ہوتے تو اُن دونوں پر بلا نظر آتا۔

جنات کو میاں فضل دین کا اپنی اولاد سے پیار و محبت کا یہ سلوک بہت اچھا لگا اور انہوں نے یہ جہرہ کیا کہ وہ رہیں گے تو یہیں مین کوٹھی کے بالکونی اور

کر کے پھر سے لیٹ گئے لیکن رضائی کے ایک کونے سے آنکھ لگائے رہے۔ انہیں نظر تو کچھ نہ آیا مگر رضائی سر سے کھینچ کر پاؤں میں اُن رہی۔ انہوں نے سر ہانے کے نیچے دکھا پسوں نکالا۔ پنگ کے نیچے جھاکا۔ دروازہ کھول کر باہر دیکھا مگر بے سود۔ ادھی رات اور شدید سردی، تھک کر پھر سے رضائی میں اُن دیکھے، خاصی دیر جاگتے رہے۔ نیند نے پھر غلبہ کیا اور رضائی میں منہ دے کر لیٹ گئے۔ ابھی آنکھ مل رہی تھی کہ رضائی پھر سے کھینچ لی گئی یہ کھینچنا تانی ساری رات جاری رہی۔

مقلانے دار صاحب صبح بالائی منزل سے جب نیچے اترے تو انتہائی پریشان اور سخت براساں تھے۔ رات کی بیداری سے انکے سینے سوجھی ہوئی اور خون سے بہہ پڑا پڑا ہوا۔ نوکر نے بہت مشکل سے ناشتے کے لیے انہیں دکھا۔ ناشتے پر انہوں نے رات جو بیٹی تھی بیان کی۔

”محبت کا یہ باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔“
میاں صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اُس دن کے بعد شیخ محمد صدیق کا جب بھی کانا ہوا، میاں صاحب کی حاضری تو ضرور دی مگر رات کی اور جگہ برسر۔

اُن ابتدائی برسوں میں ایک جتن بچے نے والدین سے منہ کی کہ وہ کچھ وقت کے لیے انسانوں میں رہنا چاہتا ہے۔ والدین نے اُسے سمجھایا کہ جتن بچے کا انسان بن کر انسانوں میں گزار کرنا بہت ہی مشکل چیز ہے ہاں البتہ اگر وہ چاہے تو بچے کی شکل و صورت میں انسانوں میں رہ سکتا ہے۔ اُس نے ایسا کرنا منظور کر لیا اور والدین نے اُسے اپنی بیوی

اندسے خود بخود گ جاتیں جنہیں کھانے کے لیے نوکر کو درجن دانوں میں سے اندر اترنا پڑنا بھی مٹی کے تیل سے جلنے والے میپ جنہیں گورلیپ کہا جاتا تھا، خود بخود چڑھ جاتے یا بجھے ہوئے میپ جل اُٹتے۔

اُن ہی شروع شروع کے دنوں کی بات ہے کہ شیخ محمد صدیق مقلانے دار میاں صاحب کے مہمان ہوئے۔ کسی نے کہا ہوش سے سوئیے گا، اس کوٹھی میں جنات کا بیڑا ہے، لیکن مقلانے دار نے ساری بات حقیر میں اڑادی۔ رات جب وہ میٹھی نیند سو رہے تھے تو کسی نے اُن پر سے رضائی کھینچ لی۔ انہوں نے نیند ہی میں رضائی اپنے اوپر درست کر لی مگر ذرا دیر دیر بعد پھر وہی حرکت ہوئی تو وہ پریشان ہو کر اُٹھ گئے۔ میپ جلایا اور رضائی درست

میری
کا ایک بھانجی ایک کرکٹ چھوٹے سے نامعلوم جزیرے کے قریب جا نکلا۔ جزیرہ بہت خوبصورت تھا اور وہاں کی لڑکیوں کو بلاشبہ دنیا کی حسین ترین مخلوق کہا جا سکتا تھا۔ جہاز کا ایک نوجوان سپاہی جلد ہی لڑکیوں میں مقبول ہو گیا۔ وہ اپنے چہرے سے ایک بے حد دلکش لڑکیوں کی تصویریں کھینچتا رہتا۔ وہ تصویریں کھینچنے کے بدلے تقریباً ہر لڑکی کو کھانے کے لیے چاہتا تھا۔ نوجوان سپاہی کے افسر نے شک بھرے لیے میں اس سے دریافت کیا: ”تم دھڑا دھڑا تصویریں کھینچ رہے ہو۔ اتنی عظیم تہائے پاس کہاں سے آئیں؟“
”فلیس“ نوجوان سپاہی نے جواب دیا۔
”فلم کس کم بخت کے پاس ہے؟“

بعض اوقات مجھ میں ایسے لوگ بھی اُن ٹھہرے جو اپنے گھر والوں سے کسی بنا پر ناراض ہو گئے تھے اور ایسے سرکاری افسر بھی جن کا یہاں تبادلہ ہو گیا اور انہیں مناسب رہائش نہیں مل رہی تھی۔ غرض کہ پاکستان بننے سے قبل ہندو مسلم اور سکھ بھی جن کا کچھ تعلق میاں صاحب سے ہوتا یہاں اُن ٹھہرتے تھے۔ کوئی ایک آٹھ دن ٹھہرا، کوئی دو چار دن اور کوئی ہفتہ دو ہفتے بعض مہمان ایسے بھی آتے جن کا قیام برسر ہاں رہا۔ میں اگر سب کا تذکرہ کرنے لگوں تو بیسے درکار ہوں گے۔ شاید آپ کے پاس اتنا وقت نہ ہو، لہذا میں اپنی اور اپنے بعض خاص مہمانوں کی چند دلچسپ باتیں مختصر بیان کرنے پر اکتفا کروں گی۔

میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میری تعمیر سے پہلے اس جگہ برسر کا درخت ہوا کرتا تھا جس پر جنات کا بیڑا تھا، لیکن میاں فضل دین نے راسخ عقیدہ، صوم و صلہ کا پابند ہونے کی بنا پر اس کو شرافات خیال کرتے ہوئے اس کی کھیر واہ نہ کی تھی اور اُس درخت کو کوٹا دیا تھا۔ جن چند ایک مدت سے یہاں رہتے چلے آئے تھے، اُس لیے انہوں نے برسر کے کٹ جانے کی زیادہ پروا نہ کی اور اپنا ٹھکانہ چھوڑا۔ وہ میرے مالکوں اور مہمانوں کو طرح طرح سے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہتے۔ بچوں کے ساتھ بچوں کا سامان رکھتے، نوجوانوں سے شرارتیں کرتے اور بڑوں سے اُن کی نیک و بد زندگی کے لحاظ سے سلوک کرتے۔

جنات کو برسر کے درخت کے کٹ جانے کا غصہ تھا، لہذا جب میں کل ہو چکی تو ہاں کر رہا تھا میاں صاحب کی نفست ہوا کرتی تھی، اکی چھیناں

مولانا محمد علی جوہر کی والدہ آماں بی کو یہاں تقریر کرتے دیکھا اور اس میدان میں عطاء اللہ شاہ بخاری نے کئی بار دھواں دھار تقریریں کیں۔ چوہدری فضل حق کی آواز میں نے سنی اور پھر قیام پاکستان سے پہلے ملک برکت علی اور میاں افتخار الدین کے جلسوں کے سٹیج میری آنکھوں کے سامنے جاتے گئے۔ ممتاز دولتانہ اور نواب ممدوٹ کی چیلنج کے بعد میرے ہی ہال کمرے میں حضور میں جناح لیگ کی بنیاد رکھی گئی اور پھر اسی ہال کمرے میں چوہدری محمد علی کی حکومت کی گئی اور انہوں نے نظام اسلام پارٹی کے سلسلے میں اسی میدان میں جلسہ کیا اور قیام پاکستان سے قبل علی گڑھ یونیورسٹی کے طلباء جب تحریک پاکستان کے سلسلے میں دوسرے پر پھٹے تو انہوں نے میرے ہی کمرے میں قیام کیا۔ زمانہ حال میں برہم پٹی اسے ادر ایم این اے اپنی انتخابی مہم کے دوران میں یہاں دو ایک جلسے ضرور کرتا ہے۔

میاں فضل دین گورا کے زمانے ہی سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ حضور کی شیخ برادری کے آپس کے چھوٹے بڑے جھگڑے یہیں طے ہو جاتے تھے۔ تھانوں اور عدالتوں میں حاکم دیکھ کھانا بے عرقی خیال کیا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ مارچ ۱۹۴۳ء میں ان کی وفات کے بعد ان کے تیسرے بیٹے میاں محمد صدیق گورا نے جاری رکھا۔ ۱۹۵۹ء میں ان کا انتقال ہوا اور ۱۹۶۰ء میں ایوب خان کا بی بی ڈی سسٹم جاری ہوا تو میاں صدیق کے بیٹے میاں فیاض احمد گورا بی بی ڈی ممبر بنے۔ میں اپنے حلقے کی مصالحتی عدالت بھی بنی۔ بی بی ڈی سسٹم کے ختم ہوجانے کے بعد اب بھی کچھ لوگ اپنے تنازاعے طے کروانے کے لیے میاں فیاض احمد گورا کے پاس چلے آتے ہیں۔

غائب ہو گئی۔ خیال کیا کہ دوست نے شرارت کی ہے۔ کمرے کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ حیران ہونے، دروازہ کھولا اور میں دبا ہوا تو روشنی کمرے میں پھیل گئی۔ سمجھ گئے کہ شرارت کسی غیر مری دوست کی ہے۔

آٹھ دس برس پہلے کی بات ہے کہ میاں صاحب کے فدا سے خالد سلیم اور پوتے مرتا حق احمد اور ان کے دوست میری بالائی منزل کی چھت پر شاہ کی محفل جہانے لگے۔ تاش کھلی جاتی اور سوڈا اور ٹوکی بوتلیں بی جانیں۔ ایک شام صاحب دستور بار نے داؤں نے سوڈے کی بوتلیں منگو کر پلائیں اور ان کے دھکن ایک طرف کو پھینک دیئے۔ کہا دیکھتے ہیں کہ وہ دھکن گھومنے لگے ہیں، پھر کبھی اُپر آتے جاتے ہیں اور کبھی نیچے آ جاتے ہیں۔ اس پر اہل محفل میں سے ایک نے گالی بک دی تو شیشے کا ایک گلاس اڑتا ہوا آیا اور ان کے درمیان گر کر پور پور ہو گیا۔ اس سے اہل محفل نہ جی۔

میرے رُخ پر اور بائیں ہاتھ کو گھٹا میدان ہے جو تحصیل کے دفاتر یہاں سے اٹھ جانے کے بعد سے چوتیوں والی منڈی کہلانے لگا کیونکہ یہاں کے پُراٹے بندی خانوں اور ان سے ملحق مکانات میں مرغ مرغیے اور بٹلے کے کام کے دیسی جوتے بنانے والوں نے یہاں بھی کام شروع کر دیا تھا۔ حضور کے جوتے نہ صرف پنجاب بلکہ پورے ملک میں مشہور تھے۔ یہ گھٹا میدان تو سکھوں کے زمانے ہی سے چلا آتا ہے۔ لیکن تحریک خلافت کے آغاز میں اس نے جگہ گاہ کا کام بھی دینا شروع کیا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے

پاؤں دابے جانے بند ہو گئے مگر ذرا دیر بعد ان کے پاؤں پھر سے دابے جانے لگے۔ اب کے میاں صاحب نے غلطی سے آنکھیں کھلیں کیونکہ یہ سعادت مندی ان کے لیے تکلیف کا باعث بن گئی تھی۔ کمرے کی مدغم روشنی میں انہیں عبدالوحید نظر نہ آیا تو حیران ہوئے، اٹھ کر دیکھا۔ عبدالوحید وہاں ہوتے تو نظر آتے۔ اب بات ان کی سمجھ میں آگئی کہ سعادت مند کون ذات شریف ہیں۔ مسکرائے اور لیٹ گئے۔ بتوڑی دیر بعد جب پھر وہی پاؤں دابے جانے کا سلسلہ شروع ہوا تو انہوں نے غیر مری مخلوق سے کہتے بہت بہت شکریہ میں تم سے بہت راضی ہوں مگر اب مجھے سو جانے دو، بہت مہربانی ہوگی۔

غیر مری مخلوق مان گئی اور میاں صاحب منگھ کی نیند سو گئے۔

میں ذمہ دار میاں صاحب کا ڈیرہ اور جہان خان تھی بلکہ بعد میں ان کے دو جوان پوتوں کی رہائش گاہ بھی بنی رہی۔ میاں صاحب کے یہاں دستور تھا کہ ان کے چار بیٹوں میں سے جس کا رٹ کاڈل پاس کر لیتا، کو کھٹی آٹا مہر نہانے دھونے کے لیے گھر جاتا اور ناشتہ کر کے کھٹی آٹا جلا سکول کے بعد کھانے کے مقررہ اوقات میں اس کا گھر جلا جوتا تھا۔

میاں صاحب کے پوتے فیاض احمد ۱۹۴۴ء میں بریک کے طالب علم تھے اور حسب دستور کو کھٹی میں مقیم تھے۔ شام کو بازار کی سرکرتے ہوئے آئے تو ان کے کمرے کے درجک دور نشیوں سے بجلی کی روشنی چھن رہی تھی۔ خیال کیا کہ کوئی بے تکلف دوست آیا بیٹھا ہے۔ زمین طے کر رہے تھے کہ روشنی

اس کے کمپوز کو تنگ نہیں کیا کریں گے۔ چنگر سے پٹے کی یہ دوستی میاں صاحب سے ان کے انتقال تک جاری رہی۔ یکم مارچ ۱۹۴۳ء کو میاں فضل دین گورا نے جب جھرو میں انتقال کیا اور ان کی منیت حضور لائی گئی یہ چنگر اٹھا بھی ان کے جنازے کے ساتھ ساتھ چلا۔ اس پر میاں صاحب کے ایک بیٹے کی نظر پڑی تو انہوں نے پکڑ کر گھر بھجوا دیا۔ اس کے بعد یہ چنگر اٹھا کسی کو نظر نہ آیا۔ نظر آتا بھی کیونکہ یہ میاں صاحب کی اولاد تو اسے ایک بڑا خیال کئے ہوئے تھی مگر وہ تھا ہی کچھ اور!

میں تو میاں صاحب کا ڈیرہ اور جہان خان تھی۔ ان کی رہائش سوڈیٹھ قدم اندر محلے میں تھی۔ جب کوئی بہت ہی معزز جہان آجاتا اور اس سے ملاقات لمبی ہو جاتی تو گھر اطلاع کر دیتے اور یہیں بٹھ لہتے۔ ایسے ہی ایک موقع پر مسونے کے بیٹے جب میرے ایک کمرے میں آئے تو وہاں ان کے پوتے عبدالوحید جو قیام پاکستان کے بعد لاہور کے رامننگ گنزور مقرر ہوئے اور بعد میں ترقی کرتے ہوئے ڈپٹی ڈائریکٹر فوڈ ریٹائر ہوئے اور ۱۹۷۵ء میں وفات پائی، ان دنوں امتحان کی تیاری کے سلسلے میں یہیں مقیم تھے۔ دادا ابا کے پاؤں دابے لگے۔

میاں عبدالوحید مجھے نیند آنے لگی ہے۔ جب نیند طاری ہونے لگی تو میاں صاحب نے کہا۔ عبدالوحید اٹھ گئے اور میاں صاحب نے کوٹ بدل لی۔ ذرا دیر بعد جہان کے پاؤں دابے جانے لگے۔ ”میاں عبدالوحید! — میاں صاحب نے آنکھیں بند کیے کیے کہا — تم گئے نہیں۔ بس اب جاؤ، میری نیند غراب ہو رہی ہے۔“

اس طرح داد اسے پرتا تک میں نے تین نیس لوگوں کے تنازعے اور جھگڑے نشانی دیکھی ہیں۔

میری آنکھوں نے نہ صرف ماہی سے لے کر چوہدری محمد علی تک قومی لیڈروں کو دکھایا اور میرے کانوں نے اُن کی تقریریں جتنی میں بلکہ بعض امیر کبیر گھرانوں کے گزرتے ہوئے بیٹوں کو بھی اپنی گود میں پناہ دی ہے اور بعض ایسے اللہ دانوں نے مجھے دکھانا دیا جو اپنے عزیز و اقارب اور ٹھکانوں کو ترک کر آئے تھے۔

پس کے ایک نواب گھرانے کے چشم و حیران نواب زادہ اسد اللہ تھے۔ ان کے والد نے اپنی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد دوسری زوجہ بیوی کو لی تھی اور اُن کے یہ زوجہ صاحبزادے اس بنابر والد سے ناراض رہنے لگے تھے۔ اُن کے دوست حسین امام تھے۔ وہ بھی کسی بنابر اپنے والد سے ناراض تھے۔ اُن کی منہ بولی قصور تھی، انہوں نے خفیہ اپنے لیے پروگرام بنایا تو نواب زادہ اسد اللہ بھی اُن کے ساتھ ہو گئے۔ حسین امام کے خفیہ کی رہائش ایک اوسط درجے کے مکان میں تھی جہاں نواب زادہ کا قیام خفیہ تھا لہذا انہوں نے میان صدیق گور سے بات کی اور انہوں نے نواب زادہ کو کہا کہ اُن کے کوہا بلا شک و شبہ گور خاندان کے لوگ اپنے رنگ روپ اور ناک نقشے میں قصور کے اگر گھڑاں سے زیادہ خوبصورت تھے لیکن نواب زادہ اسد اللہ اُن سے بھی چند قدم آگے تھے، رنگ گور یا پیشانی گور سے لب نازک قدر لگتی تھی۔ اُن کے آنے سے میری چھوٹی میں مزید اعزاز ہوا۔ وہ یہاں دوڑھائی برس مقیم رہے۔ اُن کے والد کو انھیں باقاعدگی سے ماما نہ

انکم ٹیکس آفیسر

ایک مداری ایک بڑے مجمع میں کتب و کما رہا تھا اس نے کوٹ کی جیب سے ایک لیون نکالا اور اس کے رس کا آخری قلمو تک نچوڑ لیا پھر اس نے مجمع سے مخاطب ہو کر کہا "بے کوئی مائی کا لال! اجڑا لیون سے ایک قلمو بھی نکال سکے۔" مجمع پر کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی پھر ایک آدمی آگے بڑھا اور اس لیون کو اپنے ہاتھوں میں دبا کر بت سے قلمو نکال دیے۔ لوگ حیران رہ گئے سب سے زیادہ حیرانی مداری کو ہوئی اس نے آدمی سے تعجب محسوس کیجے میں پوچھا۔ "کیا تم بھی کوئی مداری ہو؟" "نہیں!" آدمی نے جواب دیا۔ "میں تو انکم ٹیکس آفیسر ہوں۔" "شیر زمین! منظر گور۔"

بجواتے تھے لیکن میان صدیق گور اُن کی مہمانی میں کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ وطن اور عزیز و اقارب سے دوری کا دکھ بہت گہرا دکھ ہوتا ہے اور ہر دکھ انہیں دیک کی طرح چاٹنے لگا۔ آخر شہر گھر کوٹ گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ تپ دق میں مبتلا ہو کر سین ٹوریم میں داخل ہو گئے ہیں اور وہیں اُن کا انتقال ہوا۔

میان خٹل دین گور ابھی زندہ تھے کہ ایک درویش اُن کے ہاں جہان ہوئے اور انہوں نے میری دوسری منزل پر اپنا بوریا بچھ لیا۔ حسب دستور اُن کا دو وقت کا کھانا اور ناشتہ میان صاحب کے ہاں سے آتا رہا۔ اس درویش کو سوائے اللہ اور اُس کے رسول کی یاد

کے اور کوئی کام نہ تھا۔ میں بہت خوش ہوئی کہ یہاں سرکاری افسر تجارتی ذموں کے نمائندے میا صاحب کے مسلمان، ہندو اور سکھ دوست سمجھی جہاں ہوئے، لیکن اب تک کسی اللہ والے نے یہاں ڈیرہ نہیں چھایا تھا۔ اُن کا وطن تو اب مجھے یاد نہیں، شاید انہوں نے کسی سے اس کا ذکر ہی نہیں کیا تھا۔ چونکہ اُن کی مادری زبان اردو تھی اس لیے وہ دہلی یا اُس کے پار کے کسی علاقے کے رہنے والے ہوں گے۔ اس درویش کی جگہ ہی عند تھی کہ حضور کے دیدار ہوں اور اسی جگہ ہوں۔ آخر ایک دن اُس کی یہ آرزو پوری ہوئی اور وہ حضور کے دیدار سے نوازا گیا۔ حضور بنفس نفیس ایک شیر رسوا ترش لٹ لائے اُس وقت میان فضل دین بڑے دروازے کے باہر مریزین شہر کی جمل جاتے بیٹھے تھے کہ اُس درویش نے دوسری منزل کی باگونی سے دوسرے جہاں لگائی۔ "میان فضل دین خیرا اور پور کا، جہاں را دین دینا سدر جاتیں گے" لیکن انہوں نے درویش کی اس صدا کو مجذوب کی بڑ خیالی کیا اور پور نہ گئے۔

تھوڑی دیر بعد وہ درویش نیچے اترا اور اُس نے میان صاحب سے اس انہوں نے دیکھ کا تذکرہ کیا تو میان صاحب صدیق کے لیے اُپر گئے تو دیکھا کہ شیر کے پنجوں کے ناز و نازہ نشان جھٹ کی گرد پڑتے ہیں اور انہیں حضور کے شرف دیدار کی اس محرومی کا ساری عمر افسوس رہا۔ انہوں نے اپنے اس دکھ کا اظہار دوستوں سے کئی بار کیا۔

اس درویش کی عند جب پوری ہو چکی تو اُس نے وطن جانے کے لیے بوریا سمیٹا اور ایک دن میان صاحب یہ کہتے ہوئے کہ میرا وقت پورا ہونے والا

ہے، اپنے وطن جہاں ہوں، اللہ آپ کو میری خدمت کی جزائے خیر دے، اجازت چاہی۔ میان صاحب نے اُسے رخصت کیا اور نادرہ کے لیے بھی کچھ دیا۔ چند دن ہی گزرے تھے کہ وہ درویش لوٹ آیا۔ "آپ تو کہتے تھے کہ میرا وقت پورا ہو گیا ہے۔" میان صاحب نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں! وقت تو منور پورا ہو گیا ہے مگر میرا خیر اسی مٹی کا ہے اور مجھے یہیں دفن ہونا ہے۔"

میان صاحب نے درویش کے اس جواب پر ایک حرف نہیں کہا، صرف مسکرا دیے۔ درویش نے دوسری منزل میں اُسی جگہ ڈیرہ چھایا لیکن اب کے اُس کا ڈیرہ صرف دو چار دن ہی جہاں وہ اللہ کو پکارا ہو گیا۔ اُس نے وصیت کی تھی کہ کچھ بطور امانت دفت کیا جائے کہ شاید میرے عزیز و اقارب میں سے کوئی میری تلاش میں یہاں آسکے، چنانچہ اُسے رٹے بہت قریب میں گور خاندان کی پوچھ بچھ میں بطور امانت دفت دیا گیا۔ اس بات کو اب نصحت صدی سے بھی زیادہ ہو گئی اور وہ درویش خدا مست میٹھی خیر پڑا سوتا رہا۔ اُس کے کسی عزیز نے اگر اُس کی نیند میں خلل نہیں ڈالا اس درویش سے مجھے ایک ایسا عندی فقیر یاد آیا جو میان صاحب کے پاس شراب کی ایک بوتل کی فرمائش لے کر آیا تھا۔ میان صاحب ماصوم و مصلوۃ کا پابند اُس کی ایسی فرمائش کو نہ پوری کر سکتا تھا چنانچہ انہوں نے کھرا جواب دے دیا کہ میں یہ فرمائش پوری نہیں کر سکتا اور کوئی سی فرمائش کر دے، میرے بس میں ہو تو ضرور پوری کر دوں گا مگر وہ فقیر شراب کی بوتل پر ہی لبند رہا۔

جنوری کی شدید سردی کا زمانہ تھا میان صاحب

فقیر نے جس شراب کا نام یاد ری منگوادی گئی
اور بہت سا کھانا بھی ایک سینی میں لگ کر لگیا فقیر
نے کھانا کھایا اور شراب کی قبل منہ سے لگا کر غٹا فٹ
پنی گیا۔

”میاں فضل دین! فقیر نے فرور سے
جھومتے ہوئے کہا۔ ”ماگ کیا مانگا ہے؟“
”اللہ کا دیا سب کچھ ہے، کسی چیز کی حاجت باقی
نہیں۔“ مياں صاحب نے کہا۔ ”بس یہ دعا کرو
کہ اللہ میرا یہ گناہ معاف کر دے!“

”یہ تیرا نہیں میرا گناہ ہے۔“ فقیر نے کہا۔
اور اللہ دوستوں کے گناہ نہیں، اُن کی دوستی کا دیکھنے
والا ہے۔ میں جانوں اور میرا اللہ بڑا اس میں دخل
ممت دے۔ جابیش کر، تیری اولاد بھی عیش کرے
اور اُن کی اولاد بھی عیش کرے کہ اور اُن میں سے لیجن
یہی گناہ کریں گے جو میں نے کیا ہے۔ اور اللہ جانتا ہے
گا تو اپنے اس غلام کے صدر سے آتش یہی بجھش
دے گا۔“

فقیر میرا، اُنٹا اور الیا غائب ہو کر
کے گئے۔ میرا زایا اور جو کچھ اس سے کہا تھا پورا ہوا
اور مياں صاحب کے بعد اُن کی اولادوں کے کائناتے
ہوئے۔ ہر حادثہ و حادثہ سے عیش و آرام کی
زندگی بسر کر رہی، پھر اُن کی اولاد کی اولادوں کا زمانہ
کہا جاتا ہے۔ آخری ایام کو ان لگا ہے۔ مياں
صاحب کے پوتے نے بھی عیش و آرام میں گزار دی
مگر اس عیش و آرام میں حصول میں جاننا دکھا رہا ہے۔
زندگی میں یہی ہے کہ فقیر نے جو کچھ کہا ہے۔

میرے ہاں ایک ایسا مہمان بھی بہت موصد مقیم

زنج اور بے بس ہو کر ایک ایسا کام کرنے پہلا ہوں
جسے ڈونے گناہ قرار دیا ہے۔ تو میرا گناہ بننے پر قادر
ہے، میرا یہ گناہ بھی بخش دیجو جو مجھ سے سرزد ہونے
والا ہے کہ ترے اس بندے کی شوک و بیاس نے
میری رات کی نیند اور دن کا عین حرام کر رکھا ہے۔
مسجد سے مغرب کی نماز کے بعد حسب عادت
وہ کوٹھی آئے اور خزانچی سے کہا۔ ”سجواؤ مياں جس
قسم کی شراب یہ فقیر چاہتا ہے، شیشے سے لا کر
اسے دے دو اور ساتھ ہی اس کے کھانے کا نظام
بھی کرواؤ۔“

خزانچی نے میرا پیپریشانی سے مياں صاحب
کی طرف دیکھا۔

”اگر تم وہاں جانا پسند نہیں کرتے تو کسی ملازم کو
بھیج دو۔“ مياں صاحب نے کہا۔



عشاء کی افان پر اٹھ کر مسجد چلے گئے اور مسجد سے گھر
مگر اُنہیں نیند نہیں آ رہی تھی، اُن کا دھیان فقیر کی
طرف تھا جسے وہ میری دلیز پر چڑھ گئے تھے۔ وہ گھر
سے گرم دودھ کا گلاس لیے فقیر کے پاس آئے اور اُس
کی بہت منت ماحجت کی کہ کوئی نے اور اور جاکر گرم
بستر میں آرام کرے مگر اُس نے انکار کر دیا اور کہا کہ جب
نمک شراب کی قبل نہیں دواؤ گے، یہیں کوٹھی کے
سامنے پڑا رہوں گا۔ مياں صاحب نے شوکی کھلیاں
منگوائیں اور میری دلیز سے ذرا ہٹ کر ایک الاؤ
روشن کروا دیا۔ فقیر نے ساری رات اسی الاؤ کی
تیش میں کاٹ دی اور جب دن چڑھا تو اُسی الاؤ
کی راکھ کے سامنے دھڑا مار کر بیٹھ گیا۔ مياں صاحب
سے اُس زمانے میں تصور کے علاوہ فیروز پور، بلہاؤ
علی گڑھ اور جکب پور میں روٹی بیٹنے کے کارخانے
تھے اور وہ صرف شہری کے بلکہ علاقے کے بڑے
بڑے دیہوں میں شمار ہوتے تھے اور اپنے دوائے
پر اس طرح کسی فقیر کا دھڑا مار کر بیٹھ جانا انہیں بہت
کھٹک رہا تھا، لیکن اُس کی فرمائش ایسی تھی جس کا پورا
کرنا اُن کے دین میں حرام تھا، سو پورا دن ہی کشمکش
میں گزر گیا۔

شام کی آمد آمد ہوئی، سردی بڑھنے لگی تو مياں
صاحب کو حدش ہوا کہ کہیں یہ فقیر ایسی شدید سردی
میں اللہ ہی کو پیارا نہ ہو جائے۔ اُسے بہت سمجھایا
لیکن وہ فقیر بھی ایسی ضد کا کتا تھا اور دوسری رات
بھی اُس نے الاؤ کے سامنے گزار دی جو سر شام روشن
کر دیا گیا تھا۔ دوسرا دن بھی گزر گیا۔ تیسری شام ہوئی
تو مغرب کی نماز کے بعد مياں صاحب نے دوا مانگی،
اے اللہ! میں تیرے ہی ایک بندے کے ہاتھوں

رہا جو نہ صرف خود کا لنگس کا لنگرین کرنا موثر ہو بلکہ اُس
کی اولاد نے بھی وکالت اور شہرت حاصل کی اور یہ شہرت اب اُس
زیادہ ناموری اور شہرت حاصل کی اور یہ شہرت اب اُس
کی تیری قیمت میں ہے۔ وہ صاحب مولوی عبدالقادر
تھے جو گرات سے مياں صاحب کے نام اُتار سنی خط
لائے تھے۔ اُن کے پاس خمار کی سند تھی۔ وہ گرات
میں مفکوک اٹھانی کی زندگی گزار رہے تھے۔ مياں صاحب
نے کوٹھی ہی میں اُن کے طعام و قیام کا بندوبست کر
دیا اور وہ وکالت کرنے لگے۔ مياں صاحب کا مکمل باپ
اور اثر و رسوخ دور دور تک تھا جو مولوی صاحب کی
وکالت کو کھانے میں کارگر ثابت ہوا اور مولوی صاحب
کی وکالت خوب چل نکلی، پھر انہوں نے اپنی رہائش
کا بندوبست کر لیا۔

مياں صاحب مہمان نواز تو تھے ہی، دوست پرست
بھی تھے۔ حسب اُنہوں نے تصور میں رملی بیٹے
کا کارخانہ لگوا یا تو اُس کے برابر ہی مولوی عبدالقادر
کے لیے بھی زمین خرید لی جہاں بعد میں مولوی صاحب
نے ایک وسیع کوٹھی تعمیر کرائی۔ یہی وہ کوٹھی تھی جہاں
خوشید محمود قصوری کے والد مياں محمود علی قصوری اور
نایا مولوی محمد علی نے جنم لیا اور بعد میں شہرت کی بلندیوں
کو پہنچے۔

قصور کے گھر دو زبان میں جہاں بھی مياں فضل دین
گورائے اپنے اور اپنے عزیزوں کے لیے زمین
خریدی وہاں مولوی صاحب کے لیے ایک قطعہ زمین
ضرور خرید اور مولوی صاحب بعد کو اُس کی قیمت
ادا کرتے رہے۔ اس طرح وہ بھی وسیع ارٹھنی کے
مالک بن گئے، چنانچہ آج اُن کے نام پر باقاعدہ ایک
محلہ کوٹ مولوی عبدالقادر ہے۔

شیخ فضل دین دولت مند ہونے کی بنا پر میاں فضل دین کہلاتے تھے کہ یہی اس شہر کا قدیم دستور ہے کہ مالدار شیخ، میاں کہلاتے ہیں۔ میاں فضل دین سے دوستانہ مراسم کی بنا پر مولوی عبدالقادر کا گھرانہ بھی میاں کہلانے لگا، حالانکہ مولوی عبدالقادر کا تعلق درویشوں کی شاخ برادری سے تھا اور نہ ہی لاہور کے باغبانپورہ کی کاشت کار میاں برادری سے۔

میاں صاحب کے پوتوں کی جوانی کے زمانے میں کچھ میں بڑی رو فیس لگیں۔ بڑے بڑے سرکاری خزانوں کی دفتروں میں۔ دنگ رنگ کی عینیں بھی ہیں اور ان میں فیکر کے پسندیدہ مشروب کا استعمال بھی ہوتا۔ عیش و آرام کی زندگی کو چھوڑنے کے لیے میاں فضل دین کی پیدا کردہ جائداد کا ایک بڑا حصہ غریبوں کے ہاتھوں میں فروخت ہوا تو کچھ بہت دکھ ہوا اور دکھ میں انسان اس حد تک پہنچتا ہے کہ وہ کہیں بھی گویا خاندان کے ہاتھوں سے نکل کر کسی اور کی ملکیت نہ بن جاؤں۔ ادھر میری تعمیر کو قربان کر دینا میرے گھر کے لئے اور میری بگڑتی ہوئی حالت پر کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا۔ میاں صاحب کی جائداد تو ان کے مارچ ۱۹۴۳ء میں انتقال کے بعد ہی چاروں بیٹوں نے بانٹ لی تھی، صرف چھ بھروسہ کا ایک کارخانہ تھا جو سانچے میں پل رہا تھا اور اس کے بٹ جلنے کے بھی امکان پیدا ہو رہے تھے۔

آخر میرا یہ دکھ و کرب جنات کے اُس خاندان پر ظاہر ہو گیا جو اس بگڑتی ہوئی تعمیر سے بھی پہلے سے مقیم تھے۔ انہوں نے یہ بات میاں محمد صدیق کی اولاد میں فیاض احمد کے دل میں ڈالی کہ زمانہ بدل چکا ہے۔ اُس کے تقاضے بھی بدل گئے ہیں لہذا خود کو

بدلو اور پاتھ پر پاتھ دھرے بیٹھے نہ ہر روز درویشی منزل کی مرمی تھی بھی کسی دن اکھڑ کر بارش کی بات اُس کی کچھ میں آگئی۔ اُس نے میری کڑی بہت مروت کو دانی اور مجھے صاف ٹھکرا کر کہا، دہریہ ادویات بنانے کی ایک فارمیسی کھول دی۔ اس پر وہ مجھ سے تیار ہونے لگے جو میاں فضل دین کے ہمسائے حکیم عبدالقادر کے زمانے سے آکر درویشی آ کر رہتے اور ایک صاحب کا صاحبزادہ حرم غلام الشافعیں کئی برس سے اُن فنون کی وجہ سے بے حاصل کیے ہوئے تھا۔

قریباً تیرہ برس یہ فارمیسی چلتی رہی۔ ادویات کو نسخوں کے مطابق بنالیا کوئی شکل بات نہ تھی جس تو ان ادویات کی تجارت تھی جو اس دہریہ میں کے بس کی بات نہ تھی، لہذا یہ کاروبار چند برس قبل حرم ہونا شروع ہوا کہ حرمی رقم و دروازے کے ادویات فروخت کی طرف پھنس کر رہ گئی تھی، پھر قریباً تین برس قبل میاں



فیاض احمد گورائے خسارے کی اس تجارت کو بند کر دیا اور اپنی جمع پونجی موت کے کاروبار میں لگا دی جس سے اتنی آمدن ہونے لگی کہ وہ باعزت طریقے سے اپنے خاندان کی کفالت کر سکیں، لیکن اب مسئلہ میری خیر سالیانہ ویرانی کا درپیش تھا۔ فارمیسی کے کھلنے سے میرے ہال کمرے میں رونق چوڑی تھی اور دوسری ادویات میں استعمال ہونے والی مشک و زعفران میں جبکہ اٹھی تھی۔ اس کے بند ہو جانے سے خوشبو میں غائب ہو گئیں۔ ملازموں کی رونق ختم ہو گئی۔ میرے کمرے میں کمزری جالے تنے لگی اور سادوں بھادوں کی برساتوں سے میری دیواروں کا چونا جھڑنے لگا اور دروازوں کا دنگ روغن اڑ گیا۔ میں ایک بار پھر دکھ میں مبتلا ہو گئی اور جنات کے خاندان پر میرا یہ دکھ ڈھکا پھینکا نہ رہا، انہوں نے فیاض احمد گورائے دل میں ایک ایسی شے کی تجارت کی بات ڈالی جس کے بھاد اُسے دن بڑھتے گھٹتے رہتے تھے اور بھادوں کے آثار بڑھناؤ میں اس کی راہبری بھی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بگڑتی ہوئی بات ایک بار پھر ہو گئی۔

پچھلی سردیوں میں میری دیواروں کے چھڑتے ہوئے چوٹے کو آثار پھینکا گیا، ان پر سیرٹ کا پلستر ہوا میرے بیویوں دروازے اور کھڑکیاں جن کا دنگ و روغن ایک زمانے سے خراب ہو چکا تھا، پھر سے زمانہ حاصر کے خوبصورت دنگ و روغن سے چمک اٹھے اور سب سے بڑی بات میرا چہرہ دکھا جس پر میرا نام اور حضور کی مدرج میں سنگ مرمی تختیوں پر یہ شعر کندہ ہے:

محمد عسکری کا بڑی ہر دوسراست
کے کہ خاک درخش نیست خاک بر سر او
میرے چہرے کا سرخ رنگ جسے زمانے کے

انقلابات نے دھندلا دیا تھا، کثیر کے سبب کی طرح دکنے لگا۔

لوگ کہتے ہیں عمارتیں اینٹ پتھر اور چوٹے کے بے جان تودے ہیں۔ میں کبھی چوں نہیں، ہم بھی جذبات و احساسات رکھتے ہیں۔ کمینوں کے دکھانے ہم پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں، اُن کی خوشی اور خوشحالی ہمیں بھی تازگی و توانائی بخشتی ہے۔

لوگ کہتے ہیں جنات انسانوں کو تنگ کرتے اور انہیں نقصان پہنچاتے ہیں۔ میں کبھی چوں نہیں، حق نیکیوں اور اُن کی اولاد کی نئی مدد کرتے ہیں اور اگر کسی کو میری بات پر تنگ و شبہ ہو تو وہ مجھے یعنی گورا کو بھی کا نظارہ کرے۔ میری دیرانی ختم ہو چکی ہے۔ میرے استقبالیہ کمرے میں صبح گیارہ سے ایک بجے تک روزانہ میاں فیاض احمد گورائے ان کے دوستوں کی محفل گشتی، چائے اور پان کا دور چلتا ہے۔ اگر برادری کا کوئی تنازعہ ہو تو یہیں منٹ جاتا ہے۔ میرے ہال کمرے میں صبح سے آدھی رات تک بجلی کے کھلے چلتے اور برقی روشنیاں جگمگاتی ہیں۔ بلیرڈ کی شاندار میزیں بھی ہیں جہاں میاں فضل دین کے پوتوں عمران اور عثمان اُن کے پر نواسے خالد سلیم اور شہر کے اُمراء و شرفاء کے بڑے فارغ اوقات میں اپنا دل بہلاتے ہیں۔ اس سے میرا دل بھی بہلا رہا ہے اور مجھ میں بسے مگر غلوڑانے والے جن جن بلیوڈ کی میزوں پر دوڑتی اچھلتی گیندوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ میری دماغ ہے کہ ان میاں فضل دین گورا کے گھرانے کو خوش و خرم رکھے اور یہی دماغ میں بسے والے جن جن اور جن بچوں کی بھی ہے۔



کئے کو تو ہمارے سر پر اور دست تھا لیکن یہ بھی تو میں
 اس کے ساتھ ہی قریب ہی پہنچا۔ ایک ایک گھونٹا تفریح
 پر مائل نہ کر کے تھا جس میں ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کا دل نہ اٹھا۔
 چھوٹا گھاس گھاس پھوس پھوس تھا۔ رات بہر کو ملے ہوئے
 چال ایسی ہے۔ لیکن یہ گھاس گھاس پھوس پھوس ہوتا زمین پر گیند
 اٹھ کر رہا۔ یہ گھاس گھاس پھوس پھوس آگاہی مانسوں سے آگاہ اور
 ان کے یہ گھاس گھاس پھوس پھوس آگاہی مانسوں سے آگاہ اور
 کرتے ہوئے یہ گھاس گھاس پھوس پھوس آگاہی مانسوں سے آگاہ اور
 اس کا مذاق نہ اٹھاتا اور دیکھتا تو خاصوں سے دیکھتے ہوئے لگتا
 یہی وجہ تھی کہ وہی منڈی میں بیٹھنے کے باوجود ہم میں سے کوئی بھی
 چار دیواری سے باہر اس کا ساتھ نہ دینا نہ دے کر تھا۔ شکل صورت کے
 یہ اس کی تعلیم مولیٰ اور مالی حالت غریب تھی اس کا کیا اور
 جب اس نے ایک شام یہ اعلان کیا کہ منڈی اس کی شہریت ہے
 نہ ہو گئی ہے۔ یہ وہی ہے جو منڈی کے گھاس گھاس سے
 ہو گیا۔ نہیں روزی ہوتا ہے دوست جاننے والی چوڑا
 نہ اس کا دل نہ خوب صورت تھی کہ شہر کے ہر ایک سے
 یہ اس کے شہری کا یہ نام جو اپنے گھاس گھاس سے دوسرے سے
 جاننے والی نفرت تھی کہ اس کا ہمارا ہی خیال تھا کہ یہ وہ جاننے
 نہ کرنا بھی پسند کرتی تھی اور کی بار اس نے ہمارے سامنے
 یہ طرح اس کی بے مروتی کی تھی۔ جانچ یہ خبر نہ کر سکا گیا، تو
 ہم سچنے لگے اسی جین و جیل والی جس کے مذکوروں سے گلاب
 آلود تھا، جانچ یہ صورت بغض و قہقہہ اور کم تعلیم ہونے سے
 سے شادی کرنے پر یہ گھاس گھاس پھوس پھوس آگاہی مانسوں سے آگاہ اور
 جانچ نے اپنی لگائی ہے۔ لیکن یہ نہ تھا کہ یہ جانچ سے دوستی
 کا پرانی تھا۔ لہذا یہ جانچ نے دوستی نہ کر سکا اور روزی کو جانچ کے
 ساتھ نہ لگتا۔ جانچ دیکھتا ہے۔ ہم اس کو دوست وہاں جمع
 تھے اور ہم سے سات کو روزی نے ٹھکرایا تھا، احمد اور رحمت
 کے سبب ہماری بڑی بات تھی، آخر فیصلہ یہ ہوا کہ ہم میں سے دو

دو ایک دوسرے نے اتر کر دروازہ کھولا، تو اندر
 روزی کے علاوہ شہر کے بڑے بڑے
 اور جارج غائب تھا۔

روح کی واپسی

پراسرار کہانی



انہیں غصے طور پر جانچ کی بگڑائی گریں اور اس امر کا کھوج لگانے کی
 جوشش کریں کہ روزی اور جانچ کے تعلقات کی نوعیت کیا ہے اور
 کیا واقعی وہ زمین لڑکی چڑیا کے اس غلام کے ساتھ شادی پر
 رضامند ہو گئی ہے یا وہ میں نے وقت بنا دیا ہے۔ قرقر نالہ کر
 اور رینڈ کے نام پڑا۔ رینڈ تو روزی کا پرانی تھا لیکن مختلف
 کرنے کی وجہ سے یہ تھی کہ وہ مولیٰ کی نسبت جانچ سے
 اعتماد کرتا تھا۔ علاوہ ان کی شادی شہر کے بارہویں سڑکی کے
 ساتھ منی ہوئی وقت کے لیے تھا۔ لہذا روزی بھی مجھے عزت
 کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور اسے معلوم تھا میں اس کا مقید وار
 نہیں ہوں۔

مذکورہ قدرت دیکھتے دیکھتے منی ہوئی دونوں بھائی اور مجھے
 شراک ہو رہے تھے۔ کاندھت آسمان راستہ لگتا جیسے میری سوئی ہوئی
 کو لے کر اپنے گھر کے گھر میں اور میں گھر پر کیا تھا۔ پانچ بڑی
 قدرتی سے روزی اور جانچ کی بگڑائی شروع کر دی۔ جلد ہی مجھے ان
 دونوں کو ایک ساتھ دیکھنے کا موقع مل گیا۔
 جانچ کی ایک گھر آؤد صبح تھی میں جانچ کے گھر سے
 قریب ہی ایک کیفے میں ناشتے کی غرض سے گیا، تو روزی اور
 جانچ سرگ پر نظر آئے۔ انہوں نے ایک ٹیکسی کو لکھنے کا اشارہ
 کیا اور اس میں بیٹھ کر شمال کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں مشتادھوا
 چھوڑ کر اپنے گھر میں چل کر طرف دیکھا اور ان واحد میں اسے اشارہ
 کر کے ٹیکسی کے عقب میں روانہ ہو گیا۔ ٹیکسی بڑی سڑک چھوڑ کر
 قبرستان پہلے والی چھوٹی سڑک پر آگئی۔ میں نے کچھ فاصلے پر
 لکھ کا تعاقب جاری رکھا۔ سینٹ ہنز کے قبرستان کے دروازے
 پر ٹیکسی رکی اور جانچ اور روزی اتر کر اندر چلے گئے۔ میں نے
 ہمارے گھر میں سڑک کے کنارے ایک چائے فروش کے پاس
 ہمارا اور وہ تاجہ قبرستان میں داخل ہو گیا۔ قریب و غریب
 لیکن میں انہیں تلاش کرنا اور وہ بھی اس طرح کرنا نہیں میری
 رو بہ کر بہت مشکل کام تھا۔ تاہم میں نے جاسوسی کارائیوں

اور سرزنشانی کی طرف سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اکثر خوشی کے
 ایک جھنڈ میں انہیں ڈھونڈ نکالا۔

قبر کی رات۔ سچ تو یہ ہے کہ روزی بہت خوبصورت لگ رہی
 تھی۔ یہ اس کے قدموں میں بیٹھا ہوتا تھا۔ اس کا ہاتھ
 پر بہت حسرت کر رہے تھے۔ میں نے باؤل آگے بڑھا دیا۔ ایک
 ایسی جگہ چھپ گیا جہاں سے ان کی آواز غریب مٹائی دیتی تھی۔
 روزی کو میری تھی:

میں جانتی ہوں میرا ہونے والا شوہر میرے گھر پر اپنی
 جان تک قربان کرے گا۔
 تم چاہو جو مجھے آزاد کرتی ہو، جانچ نے عقیدت خندانہ
 بے میں کہا۔

مجھے تم پر اعتماد ہے۔ تم نے میرے کہنے پر اپنا ہاتھ جلتے
 ہوئے انگلیوں پر رکھ دیا تھا۔ لیکن میں زیادہ سخت آسمان
 دینا چاہتی ہوں۔ وہ ایک قدرتی جذبہ ہو سکتا ہے۔ میں میری
 وجہ سے کچھ دیر تک آزمائش میں مبتلا رہنا پڑے تو بہت بار
 بیٹھوں۔

اب مجھے کیا کرنا ہو گا؟ جانچ جیسے لکھن طور پر روزی
 کے قبضے میں تھا۔

مجھے قبرستانوں سے خوف آتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں رات کے
 وقت قبرستان میں آؤ اور وہیں آئی میں اس ان روح کی
 حقیقت معلوم کرنا چاہتی ہوں لیکن مجھ میں اتنی جرأت نہیں کہ رات
 کے وقت یہاں رہ سکوں۔ میری جگہ تم آج رات میں قبرستان
 میں بسر کرو اور دیکھو رات میں کسی وقت بھی یہاں آؤ۔ اگر
 تم موجود نہ ہوئے تو زندگی بھر تم سے کام نہیں کروں گی۔ میں اسی
 غرض سے تمیں یہاں لائی تھی۔

ایک رات تو کیا میں گھر پر قبرستان میں رہنے پر تیار ہوں؟
 ٹیکس سے قبر کی اصل اٹھا کر توبہ پر لپٹ جاؤں گی۔
 میں نہیں جیسے انہوں کی بیکٹ کا یہ ڈبا اور چلے گا۔ آخر میں اپنے

کرامت

حضرت احمد حرب کا ایک ہمسایہ آتش پرست تھا۔ ستر کے دوران اسے زاکوں نے لوٹ لیا تھا چنانچہ آپ اس کی دل جوئی کی غرض سے اس کے یہاں شریف لے گئے۔ وہ آپ کے ساتھ بہت احترام سے پیش آیا۔ وہ ذمانہ قسط سالانہ کا تھا۔ آتش پرست کو خیال آیا کہ شاید آپ کھانا کھائے آئے ہیں۔ وہ بولا۔ گو میرا مال لٹ گیا لیکن میں چیزیں لائق شکر ہیں۔ اول یہ کہ دوسروں نے میرا مال لوٹا لیکن میں نے کسی کا مال کا نصب نہیں کیا۔ دوم یہ کہ اب بھی میرے پاس نصف دولت موجود ہے۔ سوم یہ کہ میرا مذہب محفوظ رہ گیا ہے۔ سن کر آپ نے پوچھا۔ آگ کو کیوں پوجتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ اس لیے تاکہ روزِ محشر ہم کی آگ سے بھی محفوظ رہیں اور خدا کا قرب بھی حاصل ہو جائے۔ آپ نے فرمایا۔ آگ کی حقیقت تو اتنی سی ہے کہ ایک پتہ بھی اس پر پانی ڈال دینے تو بجھ جاسکے گی۔ اس کے علاوہ یہ کہ تم ایک عورت سے آگ کو پوجتے ہو! آج تک اس نے تمہارے ساتھ کیا حسن سلوک کیا جس کی بنا پر تم قیامت میں اس سے کسی بہتری کی توقع رکھتے ہو؟ آپ کے ارشاد سے متاثر ہو کر اس نے عرض کیا کہ اگر آپ میرے تین سوالوں کے جواب دے دیں تو میں مسلمان ہو جاؤں۔ اول یہ کہ خدا نے مخلوق کو کیوں تخلیق کیا؟ دوم تخلیق کے بعد رزق کیوں دیا؟ سوم رزق دینے کے بعد موت سے کیوں دوچار کیا؟ آپ نے جواب دیا۔ تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ خالق کی شناخت ہو سکے۔ رزق عطا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس کے قادر ہونے کو تسلیم کیا جاسکے۔ یہی جواب تمہارے تیسرے سوال کا بھی جواب ہے۔ یہ کہ کرب پرست دور تک آگ میں باجھ ڈالے جیتے رہے لیکن آپ کا ہاتھ آگ سے ذرا بھی نہیں جلا یہ دیکھ کر وہ آتش پرست مسلمان ہو گیا۔

کی کہ مجھے اپنے چوں کی تم کا کردار دکھانا چاہیے اس لیے دقت کا ذکر کروں گا۔ اس کی خواہش پر میں نے دوبارہ بقیہ میں دیا اور اس کے آپریشن تک جھپٹا لیا۔

تیسرے روز وہ کلب میں آیا تو روزی اس کے ساتھ تھی۔ اسی شام ان کی گفتگو ہوئی شادی کے لیے ۲۰ تاریخ مقرر کی گئی تھی۔ اس دوران میں حسبِ وعدہ میں نے کسی سے باجھ کے لیے میں ذکر نہ کیا چنانچہ وہ مجھ سے بہت خوش تھا۔ ایک بار وہ روزی کو ساتھ لے کر میرا لشکر ادا کر کے گھر پر ہی آیا۔

۱۴ مارچ کی شام اس نے مجھے فون کیا کہ میں ریمو سٹیشن پر پہنچ جاؤں وہ مجھ سے ایک فروری بات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے ہائی بھولی۔ وہ اندر روزی کیلٹ خدام پر میرے منتظر تھے۔ روزی کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ جاری بولا:

”میرے استاد دادا جان کے نہایت قریبی دوست ستر بروہن سچ کا تار کیا ہے اور نہت میاں میں اور مجھے ہر صورت سگولی جہانا چاہیے۔ روزی پریشان ہے اس کا خیال ہے میں ۲۰ تاریخ کی میٹنگ میں نہ جاؤں۔ وہاں میرے سگولی گاہکوں اس طرح شادی کا پروگرام ملتا ہے جو مجھے کتا ہے۔ تم اسے تسلی دو۔“

”روزی سچ کا تار کیا ہے؟ میں نے فوراً کہا۔ ہو سکتا ہے ستر بروہن سچ کی طبیعت زیادہ غراب ہو اور تمہیں دواں لڑکا پڑے۔“

”کیسے ہو سکتا ہے؟ جہاں میں ہر وقت پرشادی کے وقت سے پہلے پہنچ جاؤں گا۔ اور وہی دنیا اور ہر جہان سے تمہاری نزلوں گا۔“ اس نے اپنے اٹھارہ روزہ کے کرکٹ میں نے روزی کو قتل دی گروہ آفریقا تک بھی گئی رہی۔

مباحثہ ختم ہوا۔ وہ نہ چلے گئے اور دل کہہ رہا ہے ہماری شادی ملتی ہو جائے گی اگرچہ تم وقت پر نہ پہنچ سکو گے۔

باجھ جنس ویاہر مجھے اس کا خیال رکھنے کی نصیحت کے گاڑی میں سوار ہو گیا۔ میں نے روزی کو کوٹھڑا میل کے پیچھے بٹھا

میں نا پونی نہیں ہیں اور رفتی ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ اسے اعتماد چاہیے اور مجھے کوئی بلیا دوسری میں کے ذریعہ میرا اعتماد اپنی ذات پر بحال ہو سکے اور اس کی ستری میں جھپٹا دیتی میری آخری امید ہے وہ میرے لیے محمد بن عبد اللہ کی عطا ہے۔ اگر اس کے ساتھ میری شادی ہو جائے تو تم سب لوگوں پر مجھے ایک طرح سے فخر حاصل ہوگی اور یہ فخر مجھے اپنے آپ کو سمجھانے میں مدد دے گی۔ میں نے بھی ہاتھ لڑا نہیں پایا اور اب میں تم سے درخواست کرتا ہوں میرے لیے میں اپنی زبان بند رکھوں۔

”تم کہتے ہو تو میں اپنی زبان بند رکھوں گی لیکن دوست! مجھے یقین ہے رفتی کا ذہنی توازن درست نہیں کیا اور اس نے تمہیں جیتے جوتے انکاروں پر قادر رکھنا کا حکم دیا تھا؟“

”ہیں اگر میں نہیں اس کی وجہ میرا کیا ہوں۔ علاوہ ان کے اس کی خواہش پر میری گاڑی سے چھلانگ لگا چکا ہوں اور پڑے ہیں۔ میرے دنیا میں کوئی دیکھا ہوں۔ ایک بار لڑا کرتے تھے زخمی پا چھپ کی مدد کے لیے تیسری منزل سے زمین پر آئے۔ تم کو بھی یہ تھا۔ اس میں نے اس کی سبیل میں اپنا ایک لنگسٹا رتی کر لیا۔“

”تمیں یاد ہو گا میں نے تم لوگوں کے ساتھ جیتے جوتے لڑا تھا کہ گان کیسے ہوئے جو ٹٹا ہے۔ مجھے سیکھ کر رفتی کے ہاتھ ایک کتاب ملی جس میں لوگوں کی درشتی تھی۔ اس نے وہ سب درشتی مجھے کرائی اور ایک دستار لڑائی میں سر کے بال نصف گھٹنے تک ڈیول کے ساتھ کھڑا ہوا رفتی نے دھڑا کیا ہے وہ جلد ہی شادی کے لیے صاف ہی سبب سے تیار ہو سکی۔“

”شاید یہ آخری امتحان ہو رہا ہو کہ اس میں کوئی کچھ رفتی کی سالگرہ ہے اور چھپا ہوا ہے اس موقع پر جلدی شدتی ہو جائے۔“

میری گھر میں نہیں آ رہا تھا باجھ کی تعریف کوں یا اس کے بے وقوفی پر قہقہے لگاؤں تاہم اس نے میری اتنی خوشامد

پاس رکھو۔

یہ کہ روزی انکھڑی ہوئی اس وقت میں جس کی حاجت ہے پاس رکھیں۔ باجھ نے پریشانی کے سے انداز میں اس کی طرف دیکھا اور رفتی پہل ایک طرف کھسکادی اور بات پر لپٹ گیا۔ رفتی نے کچھ خشک جھپٹا لیا اس کے کوپر رکھ دیں تاکہ قربان میں اسے ملے گی جس کی نظروں پر نہ پڑے اور چھپے ہوئے قدم اٹھائی ہوئی قربان کے دوازے کی طرف چل دی ہیں۔ کچھ دور غامض کھڑا اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو اس کے برعکس جھپٹا لیا ایک طرف چپٹ کیا اور اچھٹے ہوئے کہا:

”میں میری مدد کے عمل میں صاحبہ! اب تشریف لے رہی ہوں۔“

میری آواز سن کر باجھ کے لیے پیسے چھپٹ گئے۔ وہ اٹھا۔

میرے قدموں میں لڑکھو!

”مذکور کے لیے میرے حال پر رحم کرو اور مجھے تنہا نہ چھوڑو۔“

اگر تم کسی کے سامنے میرے بارے میں ایک خط بھی مٹھنے سے صاف تو نہیں تم کو تمہاری توڑاؤ کشتی کر لیں گا۔“

”اس نے یہ بات کچھ ایسے ہی کہی کہ مجھے دم لگ گیا۔“

”میں کسی سے نہیں کہوں گا مگر تم بہر روز نکھو۔“

باجھ باہر آگیا۔ ہم دونوں زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر اچھٹے ہوئے اس نے میرا کمر لولا:

”میں جانتا ہوں تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو، تمہارا خیال ہے مجھ پر مشن کا بھرت سوار ہے۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔“

روزی کے باپ نے اس کی کال کو گھر سے نکال دیا تھا۔ ماں بیٹی اب تک ملازمت کر کے اپنا پیٹ پاتی ہیں۔ روزی نے ہمیں ہی سے اتنے تم اٹھائے ہیں کہ اسے مرد کی ذات پر اعتماد نہیں رہا۔ ہونے والے شوہر کو اپنے ہاتھوں پر بھجوانے سے اس کی انا کو تسلیں ملتی ہے۔ وہ میری چالاکی ہے اور میں چاہتا ہوں اس کا مرد کی ذات پر اعتماد و بھل ہو جائے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تم جانتے ہو شکل صورت اور مالی لحاظ سے میری حیثیت معاشرے

اور اس کے گھر حور دیا

۲۰ تاریخ کی صبح مجھ کو صبح ۷ بجے ہی گھر کا گھر پہنچنے کے لیے تیار کیا۔ ایک رخصتی ہوئی دکن کے لباس میں لائی مانی اور چنڈ دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ آئے تھے۔ کچن باریج مانے جارہے تھے گھر سے معلوم کیا، مگر پتہ چلا وہ ابھی تک سناولی سے نہیں واپس روزی نے مجھے بتایا کہ اس کا تار موصول ہوا تھا وہ صبح سات بجے والی گاڑی سے پہنچ گیا ہے سارے نو بجے تک اس کے نہ پہنچنے کا مطلب یہ تھا کہ اب وہ دس بجے والی گاڑی میں آئے گا پورے دس بجے میں حور سائیکل پر فوراً اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا تاکہ اسے سواری لینے میں دیر نہ ہو جائے۔ گاڑی میں مینٹ لیا تھا۔ دس بج کر تین منٹ سے دس بج کر دس منٹ تک یہی جب تک گاڑی اسٹیشن پر رہی میں نے اس کا ایکس ایکس ڈیا چھان مارا لیکن جارج نہیں دکھائی نہ دیا۔ یابوں ہو کر اس اسٹیشن سے نکلا اور گھر کا گھر کی طرف روانہ ہوا۔ دو دن بعد پر مجھے رینڈ مل گیا میں نے اسے دیکھتے ہی ہلنڈ آواز سے کہا:

مبارج نہیں کیا؟

”مبارج تو خیر بھی کیا ہے، البتہ اس کی حالت قابلِ رحم ہے، شاید ٹریفک کے ٹوائے میں شدید زخمی ہوا ہے۔ رینڈ ملنے پہنچا دیا۔

مجھ کو ملنے پہنچنے شادی کی رسم اور پوری عقیقہ، لیکن جارج کے گھر میں برفوں کے آثار تھے جارج واقعی روزی کے پولیس میں موجود تھا، لیکن میں نے یہ سنا کہ اس کا رنگ مچا تھا کہ اپنے خون سے تھکے ایک بار دھوٹا لیا تھا اور کندھے پر گاڑی زخم آیا تھا وہ بار بار پانی گودن میدی کی کہنے کی کوشش کر رہا تھا جیسے گودن ٹوٹ گئی ہو۔ رینڈ ملنے مجھے بتایا کہ جارج کو دس منٹ پر وہ دھڑکا ہوا گھر کا گھر میں داخل ہوا اور جب لوگوں نے اس سے پوچھا چاہا کہ تم نے اپنی کیا حالت بیان کی



ایک نوجوان کرنا مزدور ش کر ایسی بگ دل خاتون کا کوشش وہ کہتا ہے جس کا دل آٹے کی پوری کی طرح محبت سے بھرا تھا اور ہر جس کی چاہت جس کے دفائی کے برابر اسے کی خدمت نہ ہو۔ خاتون عام گھر پر روزی کی طرح بات کرنا محبت کا گھر کرنے کی عادی نہ ہو کر یہ ایک اضافی ناگہیب تقریر کی کہانے کی تاہم دشمن کے سینے پر تنگ لہنے کی پوری اجازت لڑائی کی ہر گز بشرطیکہ وہ تین دیکھے تیل کی دھار نہ کیجے۔ نکاح انتہائی سادہ کی محو رونا طریقت سے ہر گز گریا بیگ گائی جانے کی نہ چھوڑی۔ صرف تنگ چرکھا لانے کی کوشش کی جاسکتی تھی۔ جہیز میں بھی کا تیل اور مسودہ کی وال آنا ضروری ہے۔ شادی سے پہلے لڑکی کر ملت آٹھا ہر گز کہ وہ جو تلوں وال نہیں ہائے گی۔



ایک ہی پہلی پہلی دھڑکنے کے بعد ایک پتہ پہنچا جیسے دھڑکنے کا رشتہ ہے جو ہر وقت گودن کو کھٹنگا کر دکھاتا ہے اور نہ ہی ہٹنے کی حالت میں یہی کر دھڑکنے کا رشتہ کا رشتہ جو مل سلا میا میں ہر وقت تلوں کی ہر گز بشرطیکہ تلوں میں تلوں نہ ہو۔ تلوں میں تلوں کے دلے اور سر کا کھٹنگا ہی کہتے ہیں۔ دھڑکنے والے دھڑکنے رحمت ذکر کی جیسا کہ پورے آٹے والے دھڑکنے کو کھٹنگا ہے۔ یہ ہر وقت دھڑکنے کا رشتہ کہ شادی کے بعد اگر دھڑکنے کا رشتہ کہ ہر گز کہ وہ اسے چھوڑ کر نہیں چلا گا۔

ہے تو اس نے اٹھی لوں پر کھتے ہوئے اس میں خاموشی سے لگا شادی کیا اور پوری صاحب کی طرف دیکھا جیسے کہ رہا ہو، آپ شادی کی رسومات شروع کریں؟

روزی نے اس کی یہ حالت دیکھی تو ہوش ہو کر گر گئی۔ جارج نے اسے سہارا دیا۔

ماہرین دم بھرتے تھے۔ یہ جانے جارہے کی انکھوں میں کیا ہوا تھا کوئی شخص زبان سے کچھ نہ کہہ سکتا خوف کی ایک سرد لہر نے سب کا احاطہ کر لیا تھا یہاں تک کہ پوری بھی خاموشی سے اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔

دو ماہ اور دس ماہ پر تلے تو کسی نے ان پر غور نہیں کیا۔ پچھلوں کے بارگاہوں کے ہاتھ میں رہ گئے۔ دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے اور گاڑی گھر کی طرف چل دی۔ ہم چند ایک دوست محسن پر جانے کے لیے کہ جارج کو کہی حاد شیش پر آیا ہے گاڑی کے پیچھے ہو لیے۔ رینڈ گاڑی میں جارج گاڑی سے اترتا اور راستے میں اسے ڈھک لگا حاد شیش پر آیا لیکن میں تسلیم کرنے کو تیار نہ ہوا کہ میری نظر نے دھوکا لگایا ہے میں نے گاڑی کا ایک ایک تو باتش کیا تھا۔

جب ہم جارج کے گھر پہنچے تو ٹولک پر کمرہ پر ہوا تھا جارج کے گھر کے بازو میں روزی اور اس کی ماں رہتے تھے۔ روزی کی ماں اپنے مال بوی بقی تھی، معلوم ہوا گاڑی گھر کے سامنے پہنچی اور ڈرائیور نے آواز دیا کہ لاؤ تو آؤ روزی کی لاش پڑی تھی اور جارج غائب تھا۔ رشتہ داروں کا خیال تھا جارج نے

راستے میں روزی کا گلا گھونٹ دیا ہے، لیکن میں جانتا تھا وہ ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔ ہم نے اسے سارے خرمیں تلاش کیا مگر لاپرواہی نہ ہوئی پولیس والوں نے روزی کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی۔

دو ہر کے وقت پوسٹ مارٹم کے نتائج آگئے ڈاکٹر نے یہی بتایا تھا کہ کسی غریب کا نشان نہیں اور نہ گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے، موت حرکت قلب بند ہونے سے اور ایک واقع ہوئی پولیس لائفل تھا جارج کو زخمی دیکھ کر روزی ڈھکی اور اسی حالت میں اس کی حرکت قلب بند ہو گئی جارج نے اسے سزا دیکھا تو اس خوف سے کہ پولیس قتل کے مجرم میں گرفتار نہ کرے چلتی چھوٹی گاڑی سے باہر گزرا۔

لیکن تین بجے سر پر ہوا ہے یہ مذمت دوسرے گئے اور ایک ایسی محنت سارے آئی جس نے حیرت کے سبب میں ہل گیا۔ گلا گھونٹنے والے پولیس نے اطلاع دی توجہ میں کسی تیار کی صبح ۵ بجے سناولی کے اسٹیشن کے قریب جارج گاڑی ایک جھولانہ پر سے ریل گاڑی میں سوار ہونے کے لیے لیٹ ٹارم کی طرف دوڑا تو ایک تیز رفتار کار نے اسے کچل دیا لاش پوسٹ مارٹم کے بعد تین بجے کی گاڑی سے بھی جاری ہے۔

جارج صبح پانچ بجے مرا تھا ایک بجے تک پوسٹ مارٹم ہوا، میں نے اس نے شادی کی اور پھر اسے ہی میں غائب ہو گیا۔ ایک ہیلاز ہے جس پر پتہ آٹھنا کم از کم میرے لیے ممکن نہیں۔



بہ مشکل بھائی

پنری وائٹ ہینڈ

پلے نے الماری سے چھانچے لٹائی اور اس کے حلقے پیرا اپنے دائرے پر رستہ کر دیئے، سرخ سرخ غوغا اس کے منہ سے اگلے پڑا۔



نے ٹیبل فن کا پرنگا رکھتے ہوئے بروڈس سے کھڑکھڑا کر بروڈس تم آج دوپہر کو گھر پر پڑے کیسے چلے جانا۔ وہ تیار اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اس کے لیے ایک صاحب آ بروڈس اپنے آپ کو بڑی شکل سے نبھاتا تھا۔ وہ اپنی پٹ کیل میں نے ایک گرم آئیرنگ اس پر ڈالی۔ پیٹھ کے دو سے غریب اندھا لپک چکا تھا اس کا یہ درد میرے سینے کی چڑ نہیں تھا جس دن سے وہ آیا تھا اسے اس درد کی شکایت کبھی مرتبہ ہوئی تھی۔ اس مرض کی وجہ سے مجھے کافی تکلیف اٹھانی پڑتی تھی اور گھر کی دیکھ بھال میرے لیے درد سر میں گئی تھی۔ لیکن میں نے کسی اسے برا بھلا کہا نہ تو کسی سے جواب دیا کہ کسی میں اسے عزت سے برطرف کرنے کی سوجنا تو مجھے شیفتن کا خیال آیا تو میرا آئینہ بے غبار اور خیر خواہ لازم تھا اور مجھے میں بہت چاہتا تھا اسے سیر و سیاحت کا لیے مدد شوق تھا۔ اسی شوق کی بدولت اسے ایک لیے عرصے تک شفقت جہانوں میں کام کرنے اور سیر و سفر کرنے کا موقع مل گیا۔ ان جہازوں میں فہمناؤں اور اسی قبیل کے دوسرے افراد کے درمیان رہتے رہتے اسے نازداری اور گہرے معاملات میں اتنی صلاحات ہو گئی تھی کہ آج وہ ایک اچھے منتظم کی طرح میرے گھر کو سنبھال رہے تھے۔ اسی سیر و سیاحت کے دوران اس کی ملاقات بروڈس سے ہوئی تھی۔ وہ اسے انگریز کی برطانوی نوآبادی پریشانیوں کو اسے یہاں امریکن ورجن آئی لینڈ کے آیا۔ وہ سینٹ تھامس میں بھر کے ایک افسر کے گھر لازم رکھوا لیا۔ اپنے پرانے اور عزیز دوست کے حقیقی شیفتن بہت گھومنے رہتا تھا کہ کوئی اپنی اپنی جگہ کی وجہ سے بروڈس کو وہ ملازمت ختم کر دینی پڑی۔ وہ اسے میرے پاس لے آیا۔ میں نے اسے عارضی طور پر غنائماں کی جگہ سے دی۔ شیفتن کی عمر وہ بھی بڑا اچھا ملازم ثابت ہوا۔ میں اس کا اچھا ناک بیار ہو جانا۔ وہ تکلیف دہ تھا لیکن میں نے کسی اس کا تیرا نہ کیا۔ اسی لیے وہ لوگ میرے گھر آئے تھے۔ ایک دن شیفتن نے ہاتھ پاؤں میں بروڈس کی بیماری کا ذکر میرے والد اس کے خیال میں ایک چھوٹے پریشانی کی صورت



نے اس کے پیٹ کا ایک چھوٹا سا پریشان کر دیا تو اس کی دو پرہیزگار
بروس ہسپتال ہی میں رہا اور اس کے بعد یہ کرکٹ گروپس، ٹیما کر
اب وہ باطل اچھا بچا ہے۔ وہ اپنی پروردہ ست خوش اور مطمئن نظر
آ رہا تھا۔ بہت معمولی آپریشن تھا صاحب! وہ بڑے اطمینان سے بولا
پیش میں کنی فالتوی چیز پیدا ہو سکتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے کٹ
دیا ہے۔ اور اب تو مجھے بہت آرام ہے! اس نے مجھے آپریشن کی
تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔

بروس کی واپسی سے ایک دن قبل میں نے ایک عجیب چیز
دریافت کی۔ میرے مکان کی پشت پر ایک بڑا سا مٹہ ہے جس کا
فرش پر لٹے انداز میں ناخنیں دکھائی دیا گیا ہے۔ جابہی جانب اشارے
کی دیوار کے پاس ۱۰ یا ۱۲ فٹ خالی جگہ ہے۔ ایک قطار میں نوکروں کے
تین کمرے ہیں۔ پہلا کمرہ بروس کا ہے۔ شیفتنگ چوگر شہر میں رہتا تھا۔
اس لیے بروس کو یہاں لکھوا دیا۔ بتا چکا تھا بروس کی واپسی سے
ایک دن قبل میں اپنے اگلے کا جنازہ لے رہا تھا جہاں اب بھی
معاذی کی لٹی لٹی ہوئی نوکروں کے کمرے پر مشغول ہیں۔ لٹی لٹی ایک
میری نظر بروس کے کمرے اور اگلے کی دیوار کے درمیان والی خالی
جگہ میں ایک چیز پر پڑی۔ وہ کسی چمکے کا ٹوکڑا دکھائی دیتا تھا۔
ایک کیسوں کا لٹوئی تھا جس کی تھکن کے نیچے سے آگے بڑھا تو یہ
پتہ چل گیا کہ وہ باطل فالتوی طرز کی چھوٹی سی جموٹری تھی۔
جس کی چھت جنازوں کی تیلیں سے بنی ہوئی تھی۔ اور ستونوں
کے نیچے نوٹ برش کی ڈھکیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس لٹی جموٹری کا قطر
اندازاً ۱۰ اینچ اور وزن سے اونچائی تقریباً ۱۰ اینچ تھی۔ لیٹ لگتا تھا جیسے
کسی نے باہر سے اچھڑا کر اسے اندر پھینک دیا ہو۔ میں نے سوچا
اسے دھا کر کٹے کٹے ڈال دیں۔ لیکن جبر مجھے بڑی دھمکنے
والی طرز کے چمکے کا خیال آگیا۔ شاید یہ اسی کا ٹوکڑا ہو۔ میں نے اپنے
کوہن جرنل کے لیے کچھ نکالے اور اچھڑا کر اندر رکھ دیے۔
میں نے سوچا کہ یہ ستر سال ڈال دیں کل جب وہ پوچھ آئے گا تو یہ
پاکر کتنا تعجب ہو گا۔ چوں میں نے اس جموٹری کی آمد اور داخل

کی کوئی شے اندر لگائی اور مجھے اپنی انھیں پرہیزگار احساس
ہو دیں نے فوراً اچھڑا کر باہر پھینک دیں لیکن نرم کا کوئی نشان
اچھڑا نہ تھا۔ شاید اندر لگائی ہو یا تھا میں نے وہاں سے ہٹے تھے
سوچا شیفتنگ کو کمرے کا دروازہ کھول کر دیکھ لوں گی۔ وہاں سے
دکھنے دیکر اسے سامنے ہی میرے دوست مسٹر لارکر کی کراچی آنظر
آئی۔ مسٹر لارکر بڑے پر اظہار فسانہ ہیں۔ کافی دیر تک ہم لوگ باتیں
کرتے رہے۔ چلتے چلتے مسٹر لارکر مجھے اپنے یہاں کھانے پر مدعو کر گئیں۔
وہ تمام باتوں میں میں اس جموٹری کو باطل بھول گیا۔

جس دن بروس ہسپتال سے گھر واپس آیا۔ اسی دن شام کو
میں نے اپنے چند دوستوں کو کھانے پر مدعو کیا۔ ہم لوگ گیلی میں بیٹھے
تھے کیونکہ یہ گلی فری پرفیوٹ ہے۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ رات
یہیں بیٹھا کرتا تھا۔ موسم بہار میں یہاں پر دل سے بکھرتا پیدا ہوجاتا
ہو۔ اس لیے یہاں بیٹھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ اس دن شام ہی سے
سردی پڑنے لگی تھی۔ اس لیے ہم لوگوں نے سوچا کہ اب اندر لکر
بیٹھنا چاہیے۔ ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ اچانک ایک خوفزدہ مٹھی لٹائی
نے رات کا سناٹا بھڑک دیا۔ مجھے یہ احساس ہوا جیسے یہ نوٹ میری
جانب پہنچا ہے۔ میں اور میرے دوست کارسول لکر لکر کر
گڑے ہوئے نوکروں کے کمرے کی طرف دوڑے۔ بروس کے کمرے
کے دروازے سے جلی سی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ ہم لوگ دروازے
کو دھا کر اسے کھانڈ گس گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے چار بجی
ابھی جلایا گیا ہے۔ اس کی دھند روشنی میں ایک عجیب مشغور دیکھنے میں
آگیا۔ بروس اپنے پٹنگ پر ایک کونے میں سٹلا ہوا بیٹھا تھا۔ اس کا ہاتھ
بستر ایک طرف لپٹا ہوا تھا۔ چہرے پر ہوا تھیل الٹی تھی۔ اس
کے دونوں ہاتھ اس کی دائیں پینڈی پر جمے ہوئے تھے اور ان کے
درمیان سے خون کی ایک موٹی دھار نکل کر چلا رہی تھی۔ وہی فرش
پر گر رہی تھی۔ دروازہ کھلنے کی وجہ سے ہوا اندر گئی تھی۔ چہرے
لگا کارسول نے عجب کی کچھ تو خشک کیا اور کمرے کی کوئی کھول دی
میں نے بڑھ کر بروس کو پشت سے پکڑ کر چپٹ ٹھیل دیا اور اس کی

پیش کے نوکروں پر ڈاکر باندھ دیا۔ شاید اس بروٹ اعداد سے
بروس کا دماغ کچھ ٹھکانے پر آیا۔ اور اس نے اسے دے کر کہہ کر
اپنا چھوڑا پر اٹھایا۔ وہ... وہ... آپ نے اسے دیکھا تھا؟ وہ کھانے
ہوئے بولے۔ میں نے اس کی بات پر توجہ نہ دی کیونکہ میں اس وقت اس
کے زخموں کو دیکھ رہا تھا۔ میں سے بہت سا خون نکل چکا تھا۔ میں نے
کارسول کو غسل خانے سے لٹی امداد کا سامان نکال لیا۔ کھانا بروس
نے پھر پھر سے پوچھا تھا۔ آپ نے اسے دیکھا تھا؟

"کس کو؟ میں نے چمک کر پوچھا۔ میں نے اس کے چہرے کو
بغور دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دہشت چھائی ہوئی تھی۔ مجھے بہت تعجب
ہوا۔ کیا بڑا بروس۔ کونسی چیز؟ میں نے اسے تسلی دینے کے انداز
میں کہا۔

"جس نے پھر پر حملہ کیا تھا۔ بروس نے مشکل بتایا۔
"کیا چیز تھی؟ آخر؟ میں نے کچھ اچھٹے ہوئے پوچھا۔ کیا وہ اب
بھی نہیں ہے؟ اس نے ایک باؤ پٹنگ کر مجھے دیکھا اور پھر اس کی
آنکھیں بند ہوئی۔ پٹی لٹکیں۔ شاید وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ میں نے اس
کے زخم پر سے اچھڑا دیا۔ اور پھر اٹھا کر اسے اندر دھکی دیا۔ کارسول نے
اندازاً اندر سامان کے دروازہ بروس کی طرف پرتوشش آنکھوں سے
دیکھنے لگا۔ تم ذرا برا بھلا کی بول چال ہے! آؤ اس کی حالت بہت برتر
ہے۔ میں نے اسے اچھڑا دیا۔ بروس کا تمام جسم لرز رہا تھا۔ اور وہ
شاید بڑا بڑا رہی رہا تھا۔ ڈوکیا سے بچا ہوا بری طرح ڈاکر کارسول نے
برائٹی کا کلاس فرج سے اسے لٹکیں۔ اس کے کپکپاتے ہوئے
خونوں سے برائٹی کا کلاس لٹکائی تھا۔ پٹنگ کے نیچے سے کسی کے
دانت لٹکنے کی آواز آئی اور آٹا ٹاٹا کوئی چھوٹا سا لٹکا لٹکا
پٹنگ کے نیچے سے نکلا اور پٹنگ چھٹکتے ہیں۔ دروازے سے باہر نکل کر
اندھیرے میں کھینک کارسول بغیر سے پکچھے کھڑی سے چھوٹا لٹکا
کراس کے نیچے دوڑا۔ میں ہی برائٹی کا خالی کلاس پٹنگ کو کھڑی
سے باہر آگیا۔ کارسول غلیظ لٹنگ کی روشنی پھینکنا۔ جواؤں پٹنگ کیا
جس دن وہ فالتوی طرز کی جموٹری دیکھی تھی۔ اس کے علاوہ وہاں کچھ نہ تھا۔

معلوم ہوتا تھا جیسے وہ چیز یا تو اس کے اندر لگی ہوئی ہے یا اسے
مصلحت مل گئی کہ وہ اس جموٹری کی دیوار کو چھلانگ کر باہر نکل گئی۔ یہ
کیا چیز ہے؟ کارسول نے اس جموٹری کو غور سے دیکھتے ہوئے
کہا۔ کسی بچے کا کھلنا معلوم ہو گیا ہے۔

"اں پہلے اسے دیکھ کر میں بھی یہی سمجھا تھا۔ آج میں نے جواب
دیا۔ کارسول نے غلیظ لٹنگ کا دروازہ اس پر مرکز کرتے ہوئے کھلا
تھیرا تھیل ہے وہ چیز یہیں نہیں لگی ہوئی ہے۔ آج میں نے اس جموٹری کو
اٹھا کر لٹ دیا لیکن اس میں کچھ بھی نہ تھا۔ مطلب صاف تھا۔
شکار ہمارے ہاتھوں سے نکل گیا تھا۔ ہم واپس چلے آئے۔ میں نے
بروس کے زخموں کی دیکھ لی۔ اس کے زخموں کے کٹے باؤ بڑ
دھاتوں کے نشان تھے۔ ہم لوگ پھر بروس کے پاس بیٹھے۔ بروس کی
خواہش کے مطابق چار چھوٹے کھانے باہر نکل آئے۔ دعوت کا سارا
خوشگوار باطل حادثے کی تذکرہ ہو چکا تھا۔ غواہین کو گھر جانے کی بجائے
کارسول اپنی کار میں سسٹنر کر کے لگیا۔ اور میں مسرور ہو کر ان کے
ہوئی ٹنگ چھوڑنے ان کے ساتھ چلا گیا۔ اسی رات سے کچھ بیٹھ میں
گھر واپس آیا۔ تمام راستہ میرے ذہن میں بروس کے ساتھ پیش آنے
والا حادثہ گھومتا رہا۔ میں نے اس حادثے کا عجیب معلوم کرنے
کا بہتہ کر لیا۔ کچھ نہیں کہنے پاپا تھوڑا نکالا اور بروس کے پاس
پہنچا۔ وہ چمک رہا تھا۔ میں کہہ دیا کہ اس کے پاس میٹھا رہا۔ واپس
آئے ہوئے سے حفاظت کے لیے چہرے۔ وہ آگیا۔ دروازے میں
رک کر میں نے اس سے اس چیز کے متعلق وہاں سے کہہ دیا۔ جو تمام گھر چل
اور دروازے بند ہونے کے بعد وہ کمرے میں گھس گئی تھی۔ تین تیر
یہی سوچ رہا ہوں بروس! ولات ایسا معلوم ہو گیا ہے کہ میرے ذہن
میں آنے سے پہلے ہی وہ چیز میرے کمرے چھپ گئی تھی اور اس کے
کے بعد میں نے کمرے کے دروازے اندر سے بند کر دیے۔ بروس
نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ اب بھی مجھے اس کھڑکی سے خوف
معلوم ہوتا ہے۔ وہ کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا
"نہیں اسے کھلا دینے دو۔ میں بتا رہا ہوں کہ ضرورت ہے۔"

میں نے کدلی کی لسیہ پر بھی اطمینان نہ ہوا، نہیں صاحب۔ جو چیز ایک مرتبہ تجربہ کر لی ہے۔ میرے کچھ جانے کی صورت میں وہ بلا ضرور جھگڑے گی۔

”یہ وقت مت۔ نہیں میں نے کدرا کو وہ ایک طاقتور بیلو اور تب بھی اسے اس سپاٹ اور پکٹی دیوار کو پھونکنے میں کافی وقت ہو گی، بروٹس کو میری بات سے شاید اتفاق نہ تھا۔ وہ دایوسی سے سر ہانے لگا۔ نہ صاحب وہ نہ یو لایے نہ چو ہا۔

”چہرے اسے کیا کھنکھرتے ہوئے تھے پھر خدا بہتر جانتا ہے، وہ تشویش سے سر ہانے لگے۔ دایوسی۔ لیکن ابھی آدھا مٹی ہی کے ڈر کا پڑا تھا کچھ شیشی غراہٹ سنائی دی جیسے وہ جھوٹے جانور گوشت کے لیے آپس میں لڑ رہے ہوں۔ جیسے ہی میں لگا، آواز بھی بڑھ ہو گئی۔ غالباً ایک فرق شکست کھا چکا تھا اس کے چننے کے بعد پھر غراہٹ سنائی دی۔ آفت۔ وہ آواز ابیری ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ سی ہونے لگی۔ جنت کے کہنے میں اس طرف بڑھا جہاں سے وہ آوازیں آ رہی تھیں۔ ماحول پر ایک سکوت سا ملادی تھا۔ لیکن ایسی مدھم آوازیں آ رہی تھیں، جیسے کوئی چرسے کی سی چیز کو چاڑھا رہا ہو۔ میں پھر شکلا اور جیب سے ٹاپن لٹال کر روشن کر دی۔ اس گوشے میں جو لوگ رول کے کون کے برابر ہی تھا، ٹاپن کی روشنی پھیلنے لگی۔ روشنی کے محسوساتوں سے میں کوئی چھوٹی گلی کی سی چیز صاف ایک گروہ کی نظر آئی۔ پھر غائب ہو گئی۔

دوسرا فریق جو ایک مٹا کدو پر اقتدار اپنا تھا اس کے کترے ہونے فقرے سے غول بڑا تھا کچھ اچانک کچھ خراب کیا۔ میں روچہ چھوٹے کر بروٹس کے پاس آیا کیا کیا فیال ہے بروٹس؟ میں غصہ و چراغ اٹھاتے ہوئے کہا۔ یہ وہی جانور ہے کہتا ہے جس نے تم پر حملہ کیا تھا، اگر یہ وہی ہے تو اسے اچھا بدلہ لے لیا، اگر بروٹس نے کچھ دایوسی سے انکھ میں سر ہلایا، نہیں صاحب دوجا نہیں ختمیرا تو خیال ہے۔ یہ جو دایوسی کا شکوہ جو کہ ہے۔ یہ نظم نہیں دیکھ رہے ہیں آپ؟ اس نے لٹا کچھ پر سوال پڑ دیا یہی تجربہ فیضیادہ بھی مجھے تھا میں نے

جو دایوسی ایک کر اسے خدا حافظ کہہ لیا اور اپنے کمرے میں چل گیا۔ ایک چارچی نہ دیکھوں گے کہ میں بیتول کے فاسکی آواز سے اچانک گہری نیند سے بیدار ہو گیا میں نے نیند بھری آنکھوں سے نہ

لے کر تہا ہوا بروٹس کے کمرے میں گیا ہوا تھا، اگلے گنا۔ ”ماں صاحب بروٹس نے کہا کہ آپ تو درخوری کی پڑا ہوا۔ آپ کھڑکی میں دیکھیں وہاں اس کا خون پڑا ہوا تھا آپس نے کہ تو واقعی وہاں خون کا ایک بڑا وہبہ موجود تھا بروٹس کی چھاتی ساتوں گوبوں میں سے ایک تو اسے ضرور ہی لگتی تھی جس علاوہ وہاں جانور کدو کا کوئی نشان نہ تھا میں نے فیش لاسٹ دوش کر کے جانور لید بیرونی دیوار پر ہی کسی قسم کا نشان نہ تھا اچانک کوئی ٹپکی اور تازگی سی چیز میری پیشانی سے ٹکرائی۔ میں نے فوراً اسے پکڑ لیا۔ لاجل و لا قوت! اپنے جس لورڈ کو میں ملے نماز کیا سمجھا تھا وہ بیل کی ایک ٹپکی ہوئی شاخ تھی جو کھڑکی میں جھک آئی تھی۔ میں نے اسے پکڑ کر جھٹکا تو قیوں غصوں سے بھر جیسے وہ اوپر کسی چیز سے بندھی ہوئی ہے۔ میں نے کمری پر چڑھ کر اوپر جھانکا تو پتہ چلا اوپر کا سرایاں کے کپڑے سے بندھا ہوا تھا۔ میرا ششدر رہ گیا اس کا مطلب یہ تھا کہ حملہ آور اپنے حملے کو کھلیا بنا لے کے لیے۔۔۔۔۔۔ طریقے استعمال کرنا بھی جانتا ہے۔ دوسری طرف بروٹس اپنے کانا سے پر اس قدر غوروش تھا کہ واسٹے کی تفصیلات بٹکنے کے لیے اسے اتفاقاً ہی نہیں بلکہ محض شہی تھا اس نے بتایا کہ ایک بڑے جھنگ سے مشابہت سی چیز کو کھڑکی پر بیٹھا دیکھ کر اس نے گولی چلا دی۔ پس اس سے میں اتنی ہی معلوم کر سکا میرے دل میں اس چیز کو دیکھنے کی زبردست خواہش پیدا ہو چکی تھی جو ایک بڑے جھنگ کی جتنی تھی لیکن جس نے ایک ہونے تازہ سے جو کہ فخر و چہاڑا اور جس کا دلخا اکل انفس کی طرف کام کرتا تھا بل کو باغذا انداز کے ذریعے کر کے میں داخل ہونے کی کوشش کسی جانور کی عقل سے بالکل بیدار تھی۔ میں نے کھڑکی پر پڑا خون اٹھا کر محسوس کر لیا۔ لورڈ کا کدو اکل کے پاس دوسرے ہی دن

لٹک کر مرنے کے لیے بچھا دیا۔ وہ پھر ہی کوڈا کٹرے لیے فون کیا۔ اس کی آواز سے حیرت صاف ترشح تھی۔ یہ خون کا قطرہ تم نے کہاں سے لیا تھا؟ میرے جواب دینے سے پہلے ہی وہ بولا کچھ پتہ ہے تم میری کونکر کسی چھوٹے سے جانور کا خون ہے؟

”کیوں کوئی خاص بات ہے؟ میں نے پوچھا

”ہے جی۔ اور نہیں یا، وہ افلاک جیسے ہوتے بولا تعجب کی بات تو ہے کہ یہ خون انسانی ہے اور وہ بھی افروغی جیسی کا؟ میں نے بڑی مشکل سے اس ذہنی جھنگ کو برداشت کیا اور ریسور لکے ویدہ واقعات نے ایک پیچیدہ صورت اختیار کر لی تھی۔ مجھے یوں غصوں سے زور تھا جیسے یہ سب کچھ ایک انسانی ذہن کا سوچا کچھ منصوبہ ہے۔ یا پھر اتفاقات کا ایسا خاکہ جس میں بروٹس نے اپنے تخیل کی رنگ آمیزی کی ہے۔ لیکن وہ خون کا دھبہ کہاں سے آیا۔ بروٹس کے سپر پر ٹپکی ہو کر تھی۔ اور بروٹس نے اس چیز پر فخر بھی کیا تھا۔ جس کا گواہ میں خود تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر کی یہ لٹوکی رپورٹ۔۔۔۔۔۔ تو پھر یہ سب کیا تھا میرا دماغ پھٹنے لگا۔

دوسری صبح بروٹس لگا سا لٹکا آنا اپنے گھر کے کام کاج میں مشغول ہو گیا۔ میں نے اس سے سچ پر رات والی واردات کے متعلق پوچھا تو اس نے وہی کہانی لفظ بہ لفظ دہرائی۔ اتنے میں شیخین مجھ سے ملے کیا دن بھر وہ میں رہا۔ بروٹس کے معاملے پر وہ بہت تعجب تھا۔ رات کو میں سناں سے کہہ کہ وہ بروٹس کے کمرے کی اچھی طرح تلاش لے۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد وہ واپس آیا۔ میں نے سارا کدو چھان مارا صاحب! اس نے مجھے اطمینان دلانے ہوئے کہا۔ وہاں کوئی جانور وغیرہ چھپا ہوا نہیں ہے۔ بروٹس سو گیا تھا۔ اس لیے میں نے وہ روزانہ باہر سے بند کر دیا ہے۔ میں پھر ہی طرح مطمئن ہو گیا۔ رات کو دیکھنے کسی کے پکارنے سے میری آنکھ کھل گئی میں نے غور کیا تو یہ آواز بروٹس کی تھی جو میری کھڑکی کے نیچے صحن میں کھرا کچھ لگا رہا تھا۔ میں نے پتہ چنا تو وہ اپنے اہتوں سے دایاں گال دبانے کو لڑا تھا۔ مدھم چاندنی میں بھی اس کے اہتوں میں

دبا ہوا مال خون آلود نظر آ رہا تھا میں نے غسل خانے میں لے جا کر اس کے زخم کی مرہم لگی۔ یہ صحن تین گھر سے کساں سودا خ تھے۔ آپ وہ کہاں سے آیا بروٹس؟ میں نے اسے اس کے کمرے تک لے جاتے ہوئے پوچھا۔

”وہ شاید پیلے سے کمرے میں موجود تھا۔۔۔۔۔۔ اس کی آواز واضح طور پر کانپ رہی تھی۔ بے چارہ بخون سے اس کا زرا حال تھا۔ اس نے اپنے کمرے کا میٹنگ تک نہیں چھوڑا تھا۔ چاند کی مدھم روشنی ہی میں اس نے اپنے اپنی ہاتھی کی طرف غائب ہوتے دیکھا تھا۔ اور اپنا زخم دبانے کے بجائے خبر کرنے آیا تھا۔ میں نے اس کا میٹنگ چھوڑا۔ اور تمام کمرہ پھر چھان مارا مختصر سے سالن کے درمیان کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں وہ چھپ سکتا۔ میں کچھ دیر وہاں بیٹھا۔ پھر چراغ جگمگاتے دایوسی آگیا۔ صبح بروٹس ویرنگ سو تارا۔ فوجی کے قریب شیخین بانٹیا کا فٹا میرے پاس آیا کچھ دیکھتے ہی سچ کر بولا۔ صاحب وہ بروٹس وہاں بلے ہوئے پڑا ہے۔ اس کے شانے پر بہت گہرا زخم آگیا ہے۔ سارا بستر خون میں بھرا ہوا ہے۔ ایک ٹکڑے کے لیے میں ہی بوکھلا گیا۔ ڈاکٹر کو فون کر کے میں بروٹس کے کمرے کی طرف دوڑ گیا۔ میرے وہاں پہنچنے کے بعد بروٹس کو ہوش آیا۔ لیکن بڑے غایت کے اس کی آواز تک نہیں نکل رہی تھی۔ اس کے بستر کے قریب زمین پر ایک درمیانے درجے کا بیسی پاؤ پڑا تھا جس کا پیل دستے تک خون میں لٹ پڑا تھا۔ اتنے میں ڈاکٹر آگیا۔ اس نے فوراً بروٹس کے جسم میں خون پینچانے کا بندوبست کیا اور کچھ مقوی مشروبات پینچنے کے بعد بروٹس اس قابل ہوا کہ کچھ تازے کپ کے کھانے کے فوراً بعد کچھ نیند آگئی تھی۔ بروٹس نے کمنڈر شوق کیا کر میری آنکھ ڈھول کی آواز سے اچانک کھل گئی۔ یہ ڈھول پہاڑی پر بیٹے والے حبشی اپنا کوئی جادو کا عمل پورا کرنے کے لیے بھاڑے تھے۔ اچانک میری نظر اپنے ہنگ کے پہلو والی جگہ پر پڑی۔ وہاں وہی چیز اس ڈھول کی تال پر تاج رہی تھی۔

”تاج رہی تھی؟ میں نے حیرت سے اس کا حلقہ دہرایا۔

"اے صاحب! اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ وہ صندھ وقل کے نیچے سے نکل آئی تھی۔"

"اچھا! میں نے تجھ پر تیرے لیے میں کیا کچھ بات تو یہ ہے کہ اس کمرے کی کلاشی لیتے ہوئے ہم اس جگہ کو بھول گئے تھے۔ اس کے علاوہ بروٹس نے کچھ اور بتانے سے انکار کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ بروٹس اس چیز کے متعلق بہت اچھی طرح جانتا ہے لیکن یہیں بتانا نہیں چاہتا۔ میں ہی اصرار رہے سو وہ کچھ کرنا غمناک ہو گیا کہ وہ یہ ویسٹ فٹ زین جتنی جب کسی بات کا تہیہ کر لیتے ہیں تو پھر اس پر اسے رہتے ہیں۔ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔"

رات کو شیفتس نے اپنا بستر بروٹس کے کمرے ہی میں لگا لیا۔ اور میں نے وہاں تک بچل کا بندوبست بھی کر دیا۔ صبح سے پہلے مجھے شیفتس نے وہ ہتھیار بھی لاکھو دکھایا جس سے بروٹس کے گالی نہ بنی کیے گئے تھے۔ ایک شیشے کا تیز و جارو والا افروٹنی طرز کا نیزہ تھا۔ شیفتس نے بتایا کہ یہ چیز اسے بروٹس کے کمرے کے پاس ہی صحن میں ملے ہے۔ میرا ذہن بہت سی باتوں کا آج بگاڑا ہوا تھا۔ احساس معاملہ پر میں قضا غور کر رہا تھا یہ اسی قدر اچھا رہا تھا۔ وہ کیا چیز ہے جو بروٹس پر بار بار چلے کر رہی تھی۔ بروٹس کے کمرے کے مطابق وہ ایک بڑے مینڈک سے مشابہ ہے۔ لیکن اس کی حرکتیں کسی چھوٹے جانور جیسی نہیں تھیں۔ جس کے ہوت میں بیل باندھنا میرا استعمال کرتا اور جو سے حملہ کرنا میرا ہوا تھا۔ وہ تھیں۔ یہ تمام کام میرا انسان حق کا کوشش معلوم ہوتے ہیں۔ اور پھر وہ خون کا قطرہ اور ڈانڈ کی چوٹ ایندھن نہیں کہ بروٹس نے خود وہ خون وہاں ڈال دیا ہو اور اس کے بعد فارغ ہوئے ہوں۔ کچھ نہیں۔ یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ یہ کسی کی سازش ہے۔ میں میں خود اس کی جان خطرے میں پر چلے تھی۔ میں اپنی متضاد اور غیر اعتدال واقعات کے حال میں الجھتا ہی چلا آیا۔ میرے لیے اب ایک ہی راستہ تھا۔ کسی صورت بروٹس کا خون نہ کھانے کے بعد کوئی چیز اٹھ کر دوں۔ بروٹس کا خون لینا بیکار تھا۔ اس میں دوسرے خون مل چکے تھے۔ میں نے شیفتس سے وہ چادر منگوائی جو

مادھنے کی رات کو بروٹس کے خون میں ات جت ہو گئی تھی۔ اس کو صاف کر کے ڈاکٹر نے بتایا کہ اس خون اور پھلے والے خون میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ بلکہ اگر یہ لیا جائے کہ لوگ کبھی ہم سے دونوں پر خون نکال لیا ہے تو زیادہ صحیح ہو گا۔ لیکن دوسری طرف اس نتیجے سے دوسرے واقعات بالکل مل نہیں سکتے تھے۔ وہ افروٹنی ڈانڈی جھونپڑی بروٹس کے ہسپتال سے آئے تھے۔ قبل ہی گھٹن میں موجود تھی۔ وہ بیل کو کھڑکی میں بندھی ہوئی تھی۔ اور وہ چوڑا اور واقعات تو میری نظروں کے سامنے ہی ہوتے تھے۔ بروٹس کا بدن نہ صرف ایک کتہہ ہو گیا تھا۔ شیفتس کے ذریعے ہم سمجھ رہے تھے کہ کتہے کے عالم میں رات کو بچل بچتے ہوئے بروٹس نے کئی مرتبہ — کیسیس کا تمام لیا تھا۔ یہ اور اچھے بات تھی۔ جیسا اس نے کبھی شیفتس کے ڈانڈے پر سے ہل کے جو اسے بروٹس کی مناسبت سے کیسیس میں یاد کرنا تھا۔ یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ یہ تمام اس کی زندگی کے کسی دور میں اس کے ساتھ رہا ہو۔

میں اسی لاجپڑی میں تھا کہ کس سے اس گتھی کے بارے میں اچھو کروں۔ اصل میں مجھے ڈاکٹر پالین کا اشارہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کا کوشش مطالعہ ضرور میری گتھی کو سمجھانے میں مدد دے گا۔ بالآخر وہ دن بھی آگیا جب میں ڈاکٹر پالین کو اپنے ساتھ بندرگاہ سے لے کر اس کے سر پر بچا رہا۔ تھے۔ میں بروٹس کے ڈاکٹر کو تمام کامانی سنا دی۔ اختتام پر وہ بڑی دیر تک غمناک رہا۔ پھر وہ اس کے متعلق میرے سسٹنٹ ڈاکٹر روٹس نے مجھے کیسیس کی عیب بات بتائی تھی۔

"اچھا! یہ کب پڑا۔"

"اے اس نے پورے — یہ کہتا کہ وہ جیسا کہ ایک ڈاکٹر پالین حصہ تھا جس کا جو — پالین کیس لیا تھا۔ آپ پالین کے بعد ہم نے اس چیز کو دیکھا۔ ڈاکٹر پالین نے غائب ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر کچھ دیر کے لیے دیکھا کہ وہ صبح سے — کہ وہ ابھی زندہ ہے۔ ہمیں ایک کتہہ میرے سامنے نکال دیا۔ کتہے کے لیے میں مخالف الذہن ہو گیا۔ میں تصور ہی نہیں کر سکتا تھا۔ ڈاکٹر مسکرایا اچھا یہ بتاؤ۔ بروٹس پر حملہ کرنے والی

چیز تھی۔ بڑی تھی۔ میں اس کے اسے جو سوال پر غور کرتے تھے بولنا ایک بہت بڑے چوہے کے سانڈی اور رنگ بالکل سیاہ تھا۔ ڈاکٹر نے خیال انداز میں سر ہٹا کر دیکھا کہ دم اس نے ہاتھ باندھ کر دیا تھا۔ چوہے کے سر پر کھینچ کر تھپتھپاتے کر رہے تھے۔ کتہے کی ہر پہلے بروٹس کے کمرے میں گئے۔ ڈاکٹر نے اس کے زخموں کا جائزہ لیا اور پھر ہم دونوں باہر نکل آئے۔ میں نے اسے وہ جگہ بھی بتائی جہاں وہ چڑھ چھپ گئی تھی۔ ڈاکٹر نے اس کیلیدی میں جھانکا۔ دیوار اور اس افروٹنی جھونپڑی کا جائزہ لیا۔ اس کی پٹینٹ پر انکھر کے آثار نمایاں تھے۔ وہ ایک دم میری طرف مڑ کر بولا۔ تم نے اس چیز کو یقیناً اس جھونپڑی میں تلاش کیا ہو گا۔ ظاہر ہے! میں نے جواب دیا تو انہیں ہلایا۔ وہی ہو گئی۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔ یہی مل آیا میں نے قدر سے حیرت سے کہا۔ تب سمجھو۔ چھپتھپتھپتھ میں نے غصہ کیا کہ ڈاکٹر نے میری حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ میں کس کی گتھی کر اس کے قریب میں گیا۔ اچھا یہ بتاؤ تم جڑواں بچوں کے متعلق کیا جانتے ہو؟ ڈاکٹر نے ایک غیر متعلق سوال کر دیا۔ آتا ہی جتنا دنیا کے دوسرے لوگ جانتے ہیں۔ میں نے جواب دیا۔ ڈاکٹر پالین پڑا اور غالباً تم یہ نہیں جانتے کہ جڑواں بچوں کی وہ بڑی قسمیں ہوتی ہیں ایک وہ قسم جو عام طور پر نظر آتی ہے۔ یعنی دو بچے جو ایک الگ جسم رکھتے ہیں۔ دوسری وہ قسم جس میں بچے آپس میں جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ انہیں آپریشن کے ذریعے علیحدہ کرنا پڑتا ہے۔ اس قسم کو Dizygotic کہا جاتا ہے۔ ایک صورت ایسی بھی ہوتی ہے کہ ایک بچہ دوسرے بچے کے جسم میں اس طرح سا جاتا ہے کہ اس کا اپنا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ ایسا ہونا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ لیکن خدا کی قدرت میں کس کو شغل ہے۔ ڈاکٹر کو دیکھو کہ ڈاکٹر پالین کا متعلق بروٹس کے معاملے سے کیا ہے۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔ "میں تو میں بتا رہا ہوں ڈاکٹر میری بے چینی کو جانچ لیا۔ پھر چیزیں تھ بروٹس کے جسم سے آپریشن کے ذریعے لاٹ دی تھی وہ اسی Di-ygotic قسم کا بچہ تھا۔ میں ششدر رہ گیا۔ ایک لمحے کے

یہ سوچنے لگنے کی قوت سلب ہو گئی۔ اچھا اب تم اپنے ساتھ ہونے والے واقعات کی کڑیاں ملاؤ۔ ڈاکٹر نے کہا۔ اپنے پہلے حملے کے بعد تمہیں وہ چیز دینی چھوڑنی میں نہیں لی تھی۔ اسے نا؟ ان میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ میرے دماغ میں کیسیس کا نام اور خون کا تجزیہ دونوں چیزیں بھٹوڑے برسا رہیں تھیں۔ اس سے ایک کلیہ سامنے آتا ہے۔ ڈاکٹر نے کہنا شروع کیا۔ "وہ چیز انتہائی ذہین ہے۔ تم لوگوں کے کشمکش لینے کے بعد وہ اپنے گھر واپس آجاتی تھی۔ میں بوقت پین سے سر ہٹا کر رہ گیا۔ تب پہلے حملے کے زخموں پر غور کرو۔ وہ نشان یا تو صرف بندر کے ہو سکتے ہیں۔ یا پھر ایک بیدار ذی اس جسامت کے چھوٹے سے انسان کے آکرے میں ایک سکوت ٹھاری ہو گیا۔ بہت سوچ کر میں نے اثبات میں سر ہٹا دیا۔ اچھا زیادہ تفصیل میں جانے سے پہلے اس کا رنگ دیکھو۔ ڈاکٹر نے مجھے اس کے انداز میں کہنا شروع کیا۔ اس کے سیاہ رنگ سے تم ایک کتہہ پر پہنچ سکتے ہو۔ حیاتیاتی اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ مختلف انسانوں والی چیزوں میں سے ہے۔ زیادہ سیاہ فام ہو گا۔ اس کے رنگ سے کچھ بستر رنگ کا ہو گا۔ اس سے زیادہ کالا نہیں ہو گا۔ ڈاکٹر کی کمرے میں جوتے ہوئے کھلیاں میرے نظر۔ یہ کے مطابق ایسا ظاہر ہوتا ہے جیسے بروٹس کے کھلیوں میں سے ایک فرد بہت کالا اور دوسرا بہت گہرے رنگ کا تھا۔ بروٹس کا رنگ تم دیکھ رہے ہو۔ عام جھیلوں سے کتنا صاف ہے۔" ان یہ قہرے مجھے حیران کرنا پڑا۔ اب میری تمہید تھوڑی کچھ میں آگئی ہو گی اگر دو بچے پہلی قسم کے ہوتے تو ان کی رنگت بھی کیساں ہوتی۔ لیکن وہ دوسرا ہم تمہارے کتے کے مطابق بالکل سیاہ ہے۔ تب شک آئیں گے۔ ان دیکھو اس کی چند خاص وجوہات ہیں جن کی بنا پر وہ نشوونما پا کر دوسرے بچے کے جسم میں ضم ہو گیا۔ ڈاکٹر نے بڑی روانی سے کھلوا حاصل شکم مار میں پردہ پانے کے دوران ہی وہ خود وہ بچے کی نشوونما میں حصہ لیتے ہیں۔ اگر اپنا کام مقررہ مدت سے پہلے ہی ختم کر دیں تو بچہ ٹھیک کر رہ جاتا

نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ سادھو وطن، جو گویل اور قیرل کے دیس میں۔

مورس چپ رہا۔ وائٹ نے اس کے کندھے کو ہتھکڑیاں باندھ دیں۔ مورس کی ہڈیوں پر بندر کے ایک پنچے کا دھڑکاؤ کر رہے تھے۔ میں دھیان سے سن نہ سکا۔ کیا بات تھی۔۔۔؟

”کچھ نہیں۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔ مورس پریشان نظر آنے لگا۔ بندک پنچہ؟ مسز وائٹ نے حیرت سے کہا۔“

”ہاں۔۔۔ بندر کا پنچہ جس کے ساتھ باد اور طلسم کی ایک چیز ناک داستان وابستہ ہے۔“

”تھاؤ۔۔۔ طلسم۔۔۔ اور ہند۔۔۔ کیا بات ہے؟“ چرڈ نے مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔

مورس نے چرڈ کی طرف دیکھا اور پھر اپنے کوٹ کی جیب سے بندر کا ستھوڑا سا پنچہ نکال کر اپنے ہاتھ کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ بندر کا ستھوڑا سا پنچہ ہے۔۔۔ مگر۔۔۔“

”تم نے یہ کہاں سے لیا؟“

”ہندوستان میں ایک جگہ سے لیا تھا۔ وہ عجیب و غریب آدمی تھا۔ جتا دھاری۔۔۔ گندہ اور غلیظ۔۔۔ مگر لوگ اس کے پیچھے پیچھے پھرتے تھے۔ یہ پنچہ اس نے مجھے دیا تھا۔ اس پنچے کی بدولت میں آدمی، اپنی تین خواہشوں کو پورا کر سکتے ہیں۔ اب تک دو آدمی اس پنچے کو زما چکے ہیں۔۔۔ یہ ممکن کی چیز نہیں ہے۔۔۔“

وائٹ۔۔۔ چرڈ اور مسز وائٹ بڑی توجہ سے اس کی داستان سن رہے تھے۔

”کیا واقعی بندر کے اس پنچے کی وجہ سے ہندو کی خواہش پوری ہوئی تھیں؟“

”ہاں۔۔۔ مگر صرف تین خواہشیں۔۔۔ یہ شرط ہے۔“

بڑھا وائٹ لمبائی ہوئی نظروں سے بندر کے پنچے کو گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حرص کے شعلوں کی جگہ آتش دان کے شعلوں سے کہیں زیادہ تھقی اس نے ہڈیوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا: ”اب ہمارے لیے تو یہ بیکار ہو چکا ہے۔۔۔ تم اپنی تین خواہشیں پوری کر چکے ہو گے۔“

”اب آخری بار۔۔۔ یہ پنچہ کسی کی تین خواہشیں پوری کرنے کے بعد بے کار ہو جائے گا۔۔۔ ہے نا؟۔۔۔ تم نے ایسے ہی بتایا تھا؟“

”ہاں۔۔۔ مورس نے جواب دیا۔“

”پھر تم اسے اپنے ساتھ کیوں لیے پھرتے ہو؟“

”جانے کیوں۔۔۔ مورس نے جواب دیا۔“

”سوجا تھا کہ اسے بیچ دوں گا۔ مگر لوگ بندر کے اس پنچے کے کرشموں پر یقین نہیں کرتے۔ اس لیے کوئی شخص اسے خریدنے کے لیے تیار نہ ہوا اور جو لوگ تیار ہوئے انہوں نے یہ شرط مانگ لی کہ پینے وہ بندر کے اس پنچے کو زما تیں گے اور اس کے بعد اس کی قیمت ادا کریں گے۔“

”لیکن ہمارے لیے تو یہ بے کار ہو چکا ہے۔ وائٹ نے کہا۔“

”ہاں۔۔۔“

”مگر میں خاموشی بھاگی۔ آتش دان میں آگ جل رہی تھی۔ مورس کی نظریں ان شعلوں پر لگی تھیں اور وائٹ اس کے ہاتھ میں پڑے ہوئے بندر کے پنچے کو گھور رہا تھا۔ ایک دم۔۔۔ مورس کے چہرے پر تنفر اور ہرشت کے طے ملے اثرات نظر آئے اور اس نے بندر کے پنچے والا ہاتھ اٹکے کر کے پنچے کو آگ میں پھینکنے کی کوشش کی۔ وائٹ نے اچھل کر پنچہ اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور پلا کر بولا: ”کیا کرتے ہو؟“

”کاش تم اسے جل جانے دیتے۔۔۔ مورس نے داس

بچے میں کہا۔

”مگر تم اسے اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتے تو مجھے دے دو۔ وائٹ نے دل کی بات کہی دی۔“

”میں اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میرے لیے یہ بیکار ہے۔۔۔ مورس نے کہا: ”یاد رکھو اگر اس کی وجہ سے تمہیں کوئی نقصان پہنچا تو اس کا ذمہ دار میں نہ ہوں گا۔“

”میں نے منظور ہے۔ وائٹ کا چہرہ مسرت سے چمکنے لگا۔“

”وائٹ۔۔۔ تم میرے دوست ہو۔ میرا مشورہ مانو اسے آگ میں چھینک دو۔“

”نہیں۔۔۔ وائٹ نے کہا: ”اب یہ میرے پاس ہے گا۔ مگر۔۔۔ اس کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کس طرح کیا جاتا ہے؟“

”اسے اپنے ہاتھ میں پکڑ کر بلند آواز سے اپنی خواہش کا اظہار کرو۔ مورس نے کہا: ”مگر تمہیں خبردار کہ انہوں نے نقصان کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔“

”مجھے تو یوں محسوس ہوا ہے جیسے میں اللہ کی کوئی غلطی کما فی پڑھ رہی ہوں۔ مسز وائٹ نے حیرت زدہ سا ہونے کہا۔“

”رات گذرتی جا رہی تھی۔ یہ لوگ بدستور بیٹھے اشتیاق سے باتیں کر رہے تھے۔ بندر کا پنچہ وائٹ کے کوٹ کی جیب میں تھا۔ چرڈ نے محسوس کیا جیسے اب اس کمرے کی فضا پینے پینے نہیں رہی۔ اس سے جو بھلن کا عجیب سا ناقابل فہم اور ناقابل اظہار احساس ہو رہا تھا۔ ان کا سامان۔۔۔“

”مورس اپنا ہاتھ اٹھ کر اٹھا اور بولا۔“ وائٹ۔۔۔ اب مجھے اجازت دو۔ میں کل ہندوستان چلا جاؤں گا۔ خدا کرے تم غرض و غم رہو اور میرا لب بھی ہی مشورہ ہے کہ اسے تلف کرو۔۔۔ بھلا دو۔۔۔ اپنے پاس مت رکھو۔“

”وائٹ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے ہڈیوں سے دست کاٹ دیا اور اس کو ساتھ لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

جب وہ وائٹ کے آنکھوں میں بے تابی اور بے چینی دیکھ رہا تھا۔

چرڈ اور مسز وائٹ حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ وہ کمرے کے وسط میں کھڑا ہو کر کہنے لگا: ”اب میں اپنی پہلی خواہش کا اظہار کرنے والا ہوں۔“

چرڈ اور مسز وائٹ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز اور بے قاعدہ ہونے لگیں۔ مسز وائٹ نے کمرے کی پشت کے ساتھ سر لگایا۔ وائٹ نے جیب سے بندر کا پنچہ نکالا۔ اسے ہاتھ میں پکڑ کر اپنی نظریں اس پر گماڑ دیں اور لاپتی ہوئی بلند آواز میں کہا: ”میری پہلی خواہش یہ ہے کہ مجھے دو سو پونڈ مل جائیں۔“

الفاظ اس کے منہ سے نکلے ہی تھے کہ اس کی چیخ نکل گئی۔ اس کی بیوی ہڑبڑا کر اٹھی اور اس کی طرف بھاگی۔ چرڈ نے اپنے باپ کے من اور جامہ کیم کو ہلاتے ہوئے پوچھا: ”ڈیڈی کی خواہش؟“

”یہ چل رہا تھا۔۔۔ اس نے گھرائی ہوئی آواز میں کہا۔“

بندک پنچہ حرکت کر رہا تھا۔۔۔ بندر کا پنچہ فرش پر پڑا تھا۔

جب میں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو اس میں جان پڑ گئی۔

میرے ہاتھ میں بولی سرسراہٹ لگا جیسے سانپ ہو۔۔۔

مگر تندی خواہش کب پوری ہوگی؟ مجھے تو کہیں دو سو پونڈ نظر نہیں آ رہے، چرڈ نے کہا: ”بندر کا کمرہ پنچہ کس طرح حرکت کر سکتا ہے؟ یہ آپ کا وہم تھا۔۔۔ وہ ہاتھ سے چھو کر زمین پر گر گیا تھا۔“

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ یہ ہمارا وہم ہو گا۔ مسز وائٹ نے کہا۔“

”میں کیسے مان لوں کہ یہ میرا وہم تھا؟۔۔۔ وائٹ نے چرڈ کو کہا۔“

رجوڑ نے اپنے باپ کو آستانہ کے سامنے کرسی پر بٹھلوا دیا۔ آگ دھک رہی تھی۔ وائٹ نے بیٹھے سے پہلے لڑتے ہوئے ماتحتوں سے بندک پتھر فرش سے اٹھایا اور پھر اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ اس کا چہرہ زندہ اور ہوش کانپ رہے تھے۔ باہر ہوائ تیزی سے چلتے تھے مٹی اور روناؤں اور کھڑکیوں سے ٹھوکر خوں خوں سا شور پیدا کر رہی تھی۔ اس کے شور میں دہشت تھی وہ تینوں چپ چاپ آگ کی نظر منہ کیے بیٹھے رہے۔

اس خوفناک رات کی صبح چمکیلی اور روشن تھی۔ مطلع صاف ہو چکا تھا۔ ٹانٹے کی میز پر پیر و زرات کے واقعے کا مذاق اڑاتا رہا۔ مگر وائٹ ابھی تک زرد نظر کرتا تھا۔ مسر وائٹ نے بھی اپنے شوہر کے مزاج کو خوشگوار بنانے کے لیے چند شکستہ جملے کہے مگر وائٹ چپ رہا۔ بھیار مارا چرڑ ٹانٹے سے فارغ ہو کر اپنے کارخانے میں جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ مگر سے نکلتے وقت اس نے اپنے باپ سے کہا "ڈیڈی اگر آپ کی خواہش میری عدم موجودگی میں پوری ہو گئی تو میرا انتظار کر کے بیٹے خرچ کرنا۔"

مسر وائٹ نے حسب معمول رجوڑ کے ماتھے کو چوما اور اسے دیر تک گھر سے نکلتے اور ملکہ پر پلٹے دیکھتی رہی۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اپنے کام کاج میں الجھ گئی۔ ایک گھنٹے بعد جب وہ دوبارہ وائٹ کے کمرے میں آئی تو وہ اسی طرح بیٹھا تھا۔ اس نے کچھ کھانا کھا کر اس کی نظریں اپنے گھر کے بڑے گیٹ پر جم گئیں۔ ایک آدمی داخل ہوتا ہوا تھا۔ انہی کا قیمتی لباس بڑی خوش اسلوبی سے سلا ہوا تھا۔ مسر وائٹ دروازے کی طرف گئی۔ انہی کا استقبال کیا اور اسے اپنے شوہر کے پاس لے آئی۔ انہی کی نظریں کمرے کی چیزوں کو گھومتی ہوئی وائٹ کے چہرے پر جم گئیں۔

"مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں آپ سے ملوں میں آپ کے بیٹے کے کارخانے سے آیا ہوں۔۔۔ میرا مطلب ہے جہاں وہ کام کرتا ہے۔"

بوڑھی مسر وائٹ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ گھبرا کر بول "خیریت تو ہے نا؟ رجوڑ تو ٹھیک ہے نا؟"

وائٹ نے اپنی سفید بھونوں کو اوپر اٹھا کر گلابی سے کہا "تشریف رکھیے۔۔۔ بیٹھ کر بات کیجئے۔"

"مجھے افسوس ہے کہ میں۔۔۔ انہی نے غمزہ بچے میں کسا اور چپ ہو گیا۔"

"کیا رجوڑ زخمی ہو گیا ہے؟ کیا اسے کوئی حادثہ پیش آیا ہے؟"

"ہاں۔۔۔ وہ بری طرح زخمی ہوا ہے۔۔۔ مگر اب اسے کوئی تکلیف نہیں ہے؟"

"اور۔۔۔ میرے خدا۔۔۔ تیرا احسان۔۔۔ تیرا شکریہ مسر وائٹ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "مگر اس کی نظر ابھی تک اس کے چہرے پر پڑی۔"

انہی نے ٹھنڈے اور خشک لمبے میں کہا "وہ شین میں چھنس کر کھلا جا چکا ہے۔"

"وہ شین میں چھنس گیا ہے۔۔۔ مسر وائٹ لرزنا لگی۔ وائٹ نے جلدی سے اسے تمام لیا مگر وہ۔۔۔ صبر۔۔۔ خدا کو یہ منظور تھا۔۔۔ پھر نفرس اٹھا کر انہی سے کہا "رجوڑ۔۔۔ ہم دونوں بوڑھوں کی الگوئی اولاد بھی بھارت لیے یہ صبر ناقابل برداشت ہے۔"

انہی جیسے سے کھٹکا اور کہنے لگا "مجھے کارخانے کے مالکان کی طرف سے ہدایت کی گئی ہے کہ میں آپ ملک ان کے جذبات پسندیدہ ہوں۔ ہم سب کو رجوڑ کی موت پر بہت دکھ ہوتا۔ دونوں بوڑھے چپ رہے۔ بوڑھی عورت کا چہرہ سفید جسم میں رعشہ اور آنکھوں میں آنسو تھے۔

وائٹ کا سپرد سر پہل رہا تھا جیسے کہ رہا ہوندا کی مرضی۔۔۔ خدا کی مرضی!

اس حادثے کی تمام حسد واری موتی پر ماند ہوتی ہے انہی نے کہا "اس کی اپنی غلطی کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوئی ہے۔ اس کے باوجود کارخانے کے مالکان نے اس کی خدمات کو مد نظر رکھتے ہوئے آپ کے لیے کچھ قسم کی بھیجی ہے۔"

وائٹ نے اپنی بیوی کا بازو چھوڑ دیا۔ اس کے چہرے پر خوف اور دہشت کی سیاہی نظر آرہی تھی۔ اس کے خشک لب کی بارگاہیے اور پھر اس نے پوچھا "کتنی رقم؟"

"دو سو پونڈ۔۔۔ انہی نے جواب دیا۔"

اپنی بیوی کی چیخ سے بے خبر بوڑھے وائٹ نے اندھوں کی طرح اپنے ماتھے آگے بڑھائے اور غشش کھا کر گر پڑا۔

قبرستان گھر سے دوسیل کے فاصلے پر تھا جہاں رجوڑ دفن کیا گیا۔ سب کچھ آٹا ناٹا سی ہو گیا تھا۔ ان کے دماغ پھاگئے تھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ مگر بل جوں وقت گذرتا گیا۔ وائٹ اور اس کی بیوی کو ہسپتال لے لگا کہ ان کے بیٹے کی موت ایک اتفاقی حادثہ نہ تھا۔

لمرہ بندر کے کچھ بچے کی کارستانی ہے۔

بوڑھے رجوڑ سے رفا مونی چٹائی ایک رات بپ وائٹ کی آنکھ لگی تھی کہ اپنی بیوی کی چیخ سن رہا تھا۔

"پتھر۔۔۔ وہ چیخ رہی تھی۔ بندر کا پتھر کمال ہے وہ بندر کا پتھر کمال ہے؟"

کیا پتھر؟ بوڑھے وائٹ نے پوچھا۔

مجھے بندر کا پتھر چاہیے۔ مسر وائٹ نے کہا تم نے اسے جلاؤ نہیں دیا؟

"نہیں وائٹ بولا میری میز کی دراز میں پڑا ہے۔"

نہاکیا تھیں؟ مسر وائٹ بالکون کی طرح بیٹھے لگی۔ آٹا۔۔۔ میں بھی کتنی احمق ہوں کہ بھولی ہی گئی تھی۔ تم رجوڑ کے باپ ہو۔۔۔ تھیں ریخیال کیوں نہ سوچا۔۔۔ آٹا۔۔۔ مگر میں ماں ہوں۔ ریخیال پہلے میرے دل میں ہی آنا چاہتے تھے۔۔۔ میں ماں ہوں نا؟

"کیسا خیال؟ کون سا خیال؟"

"مجھے تم اپنی دو خواہشوں کو پورا کر سکتے ہو۔۔۔ ماں باقی دو خواہشیں۔۔۔"

"کیا ایک ہی خواہش کی تکمیل ہمارے لیے کافی نہیں ہوڑھا اب بھی اپنی بیوی کے خیال کو نہ پاسکا تھا۔"

"نہیں۔۔۔ اس کے کعبے میں جوش اور تندی تھی۔"

"ابھی جاؤ اور بندر کا پتھر ماتھے میں لے کر اس خواہش کا اظہار کرو کہ ہمارا بیٹا دوبارہ زندہ ہو جائے۔"

بوڑھا یوں زمین پر بیٹھ گیا جیسے کسی نے اس کے بوڑھے اور کمیت شانوں کو دبا کر اسے بیٹھنے پر مجبور کر دیا ہو کہنے لگا "کیا تم پاگل ہو گئی ہو؟"

موقت ضائع نہ کرو۔ اس نے جلا کر کما جلدی کرو۔۔۔ جلدی۔۔۔ میرا بیٹا۔۔۔ کہہ میرا بیٹا۔۔۔

مجاہد کر سوجاؤ۔ بوڑھے نے کہا "تم ہوش میں نہیں ہو۔"

"تم جلدی کرو میں کچھ نہ سنوں گی۔ اس کی بیوی نے کہا۔ ہمارا بیٹا دوبارہ زندہ ہو سکتا ہے۔ اگر ایک خواہش پوری ہو سکتی ہے تو دوسری کیوں نہیں؟"

وہ ایک حادثہ تھا۔۔۔ اتفاق تھا۔۔۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ وہا سے کھینچنے کی باتیں دوسری خواہش کا اظہار نہ ہوگا۔ ہمارا بیٹا دوبارہ زندہ ہو سکتا ہے۔"

سے اٹھا۔ اسے بیوی کا وہ بلا سنا دیا جلدی آواز سے
چٹختی کھول دو۔ وہ باہر ٹھہرنا ہوگا میرا بیٹا۔
اس کی بیوی اسے آواز دے رہی تھی چیخ رہی
تھی۔ بوڑھے نے اپنی بیوی کی چیخ و پکار پر کان نہ دھرا اور
بندر کے پتے کو ہاتھ میں لے کر اپنی تیسری اور آخری خواہش
کا اظہار کر دیا۔

دستک کی آواز میں فرما بند ہو گئیں۔ پھر بوڑھے نے
چٹختی کھلنے کی آواز سنی۔۔۔ وہ تیزی سے اپنی بیوی کی طرف
بھاگا۔۔۔ جو دروازہ کھول کر باہر دیکھ رہی تھی گلی میں مجھے
کاٹ بلی روٹی بھر رہا تھا۔۔۔ بسنسٹان اور دیران،
گلی میں ایک سایہ نظروں سے اوجھل ہوتا جا رہا تھا بوڑھے
کی تیسری خواہش پوری ہو چکی تھی۔



دروازے پر بار دستک پوری تھی۔ کمرہ تاریک تھا
بوڑھی عورت نے پورا زور لگا کر اپنے آپ کو بوڑھے کی
گرفت سے چھڑا لیا۔ بوڑھا اس کے پیچھے لپکا۔ اس نے
دروازے کی زنجیر کھلنے کی آواز سنی اور پھر اپنی بیوی کی آواز
۔۔۔ چٹختی آواز۔۔۔ چٹختی بہت اونچی ہے۔ میرا ہاتھ نہیں پہنچ
سکتا۔۔۔ اسے کھول دو۔

بوڑھا اس کی آواز سن کر پیچھے کی طرف بھاگا۔ وہ
دوسرے کمرے میں جا کر تاریکی میں ٹھوکریں کھاتا ہوا۔۔۔
بندر کا بیچ تلاش کر رہا تھا۔ اس نے اسی تلاش کے دوران
کوسی کھینٹنے کی آواز سنی۔ اس کی بیوی کوسی کھینٹ کر
دروازے کے قریب رکھ کر اوپر چڑھ کر کھولنا چاہتی تھی
پھر اس نے کوسی کے گرنے کی آواز سنی اور اسی وقت۔۔۔
اس کا ہاتھ۔ بندر کے جتنے پر پڑ گیا۔ اس نے اسے جلدی

میں تادیبی چھاتی مسزوائیٹ اپنے شوہر کے پاس جا کا
ہوئی۔ دونوں چپ رہے۔ گھڑی کی ٹنگ ٹنگ تکی آواز
کے دونوں پر تھوڑے کی طرح جڑ رہی تھی۔ اچانک بوڑھے
نے دیا سلائی بھلائی اور موتی لینے کے لیے نیچے والے
کمرے میں اترنے والی میزٹھیلوں کی طرف چل دیا جب وہ
آخری میزٹھیل پر پہنچا تو اس نے بوڑھے دروازے پر دستک
کی آواز سنی۔ وہ یوں لرز کر دیا سلائی اس کے ہاتھ سے گر
پڑی اور اندھیرا پھیل گیا۔ وہ جسے حرکت کھارنا دسنا
پھر سنا دی تھی پھر تیسری بار۔۔۔

یہ کیسی آواز ہے؟ بوڑھی عورت نے چیخ کر کہا۔
”ہوا ہے۔ بوڑھا بولا۔

”نہیں۔۔۔ یہ دروازے کے ہاتھ کی دستک ہے بڑھیا
نے اشتیاق سے کہا۔ وہ اسی طرح دستک دیا کرتا تھا میں کمر
کی دستک کا مخصوص انداز نہیں سمجھ سکتی۔۔۔ وہ دروازے
کی طرف بھاگی مگر اس سے پہلے بوڑھا دروازے کے قریب
پہنچ چکا تھا۔ بھتی ہوئی دیا سلائی کی مدد میں دروازے
کے باہر۔۔۔ شیشے سے ایک ایسا چہرہ دیکھ چکا تھا جو لڑا
دینے والا تھا مسلا بھلا اور رونما ہوا چہرہ۔۔۔ اس نے زلہ
سے اپنی بیوی کا بازو پکڑ لیا۔

”کیا کر رہے ہو؟ دروازہ کھولنے دو بڑھیا نے چیخ کر
کہا۔ میرا بیٹا آگیا ہے۔ میرا چڑا آگیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو
چھڑانے کے لیے بوڑھے کے ساتھ کھٹکتا ہو رہی تھی دھجے
دروازہ کھولنے دو۔ وہ سردی میں ٹھہر رہا ہوگا۔
”خدا کے لیے دروازہ مت کھولو۔۔۔ بوڑھے نے
لڑتے ہوئے کہا۔

”تم اپنے ہی بیٹے سے خوفزدہ ہو؟ بڑھیا نے تہرا کو
لبے میں کھا لیسے باپ ہو تم؟۔۔۔ دروازے۔۔۔ میرے بیٹے
۔۔۔ چڑ۔۔۔ میں آ رہی ہوں۔ میں دروازہ کھول رہی ہوں۔

”اسے مرے دس دن ہو چکے ہیں۔ بوڑھا آہستہ آہستہ
کہنے لگا۔ ہم تو اسے یہاں بھی نہیں سکیں گے۔۔۔ جہنم یاد ہے
کہ لوگوں نے ہمیں آخری بار اس کا چہرہ بھی نہ دیکھنے دیا تھا
وہ شیشے میں پکڑا گیا تھا۔ اس کا چہرہ اور اس کے اعضاء قوت
بھرت گئے تھے۔ مسخ ہو گئے تھے۔ اس کی آواز جھلکی
”تم اسے اس حالت میں زندہ دیکھ کر مرنے والے؟“

”نہیں۔۔۔ بوڑھی عورت نے چیخ کر کہا۔ کیا کوئی دل
اپنے بچے سے ڈر سکتی ہے؟ بائیس باتیں کرتے ہو۔ اسے
واپس لاؤ۔ بندر کا پتھر اسے واپس لاسکتا ہے۔“

بوڑھا حجاب سوکر دوسرے کمرے میں چلا گیا جہاں
میز کا دروازہ کھول کر اس نے بندر کا پتھر باہر نکالا۔ اسے چھوٹے
بی اس نے یوں محسوس کیا جیسے سردی کی تیز لہر اس کے
جسم میں سرایت کر گئی ہو۔ تاریکی میں وہ کمرے سے باہر نکلنے
لگا۔ دروازے سے ٹھوکر لگا، خوف اور دہشت سے اس کا
جسم ٹھہرے پسینے سے منگایا جب وہ اپنی بیوی کے پاس
پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی کا چہرہ پہلے سے کہیں
زیادہ زرد ہو چکا تھا۔

”بولو۔۔۔ مانگو۔۔۔ وہ چٹتی۔
وہ چپ رہا۔

”جلدی کرو۔ وہ پھر بھلائی۔
اس نے بندر کا پتھر بائیں ہاتھ میں لیا اور افسردہ آواز
میں بولا۔ میری دوسری خواہش یہ ہے کہ میرا بیٹا زندہ ہو جائے۔
بندر کا پتھر اس کے ہاتھ میں ریٹکنے لگا اور فرش پر گر
پڑا۔ بوڑھا کرسی میں یوں دھنس گیا جیسے اس کی جان نکل گئی
ہو۔ مسزوائیٹ آہستہ آہستہ کھڑکی کی طرف بڑھی۔ اس نے
کھڑکی کھول کر باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھیں اپنے
بیٹے کے انتظار میں پک رہی تھیں۔ شہدائے عیسیٰ عیسیٰ عیسیٰ
شعشع کا شعلہ دیکھنے سے پہلے آخری بار پھر پڑا اور کمرے



اسلے واقعہ کا علم صرف دو افراد کو ہے، ایکے کھنڈے جیسے مکان میں
رہنے والے پاگل عورت کو اور دوسرے مرد مجھ "

آسیبی پھول

ولیم گرائے



تو میرا یہ حال ہو گیا ہے کہ بہت معمولی چیزوں سے خوفزدہ ہو جاتی ہوں۔ چمکدار دھوپ، گھاس پر پڑنے والے
آبے گہرے ساتھ سفید گلاب۔ سرخ بالوں والے بچے اور... ایک معمولی سا نام۔ یعنی 'میری'؟ یہ خوبصورت
چیزیں بھی مجھ کو خوفزدہ کرنے والی ہو سکتی ہیں لیکن میرا عجیب حال ہے کہ ان چیزوں کی خوبصورتی ہی میرے لیے خوف
کا باعث بن گئی ہے۔

مجھے ابھی طرح یاد ہے کہ نئی کرشنا نے جب پہلی دفعہ میری کام میرے سامنے لیا تھا۔ تو اسی وقت میرے
ذہن میں کچھ خدشات پیدا ہو گئے تھے۔ لیکن یہ اس قدر معمولی تھے کہ میں نے وہی طور پر انہیں زیادہ اہمیت نہ دی۔
کرشنا کی عمر اس وقت پانچ سال ہو چکی تھی اور تین ماہ کے اندر اسے سکول جانا شروع کر دیا چاہیے تھا وہ بڑا خوبصورت
دن تھا۔ صارت سے بھری ہوئی چمکدار دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور کرشنا اپنے معمول کے مطابق پائیں بائیں ٹھیل
رہی تھی میں نے جھانک کر دیکھا تو وہ ہیٹ کے بل لیٹی فریڈی کے پھول تو توڑ کر بڑی عنت سے ان کے دریا کر کوئی
تھی۔ سوج کی روشنی میں اس کے کچے سرخ بال جھک رہے تھے اور اس کی جلد نہایت سفید نظر آ رہی تھی۔ ہارنٹ کے
انہاں میں اس کی بڑی بڑی نیلی آنکھیں پوری طرح کھلی تھیں اور پھولوں پر مڑو تھیں۔
اچانک اس نے سفید گلاب کی اس جھاڑی کی جانب دیکھا۔ جس کا گہرا سا یہ گھاس پر پڑ رہا تھا، اور سکڑاتے

ہوئے بولی۔

ہاں ایس کرشنا کی بولی۔

یہ کہہ کر وہ اٹھی اور آہستہ آہستہ اس جھاڑی کی طرف بڑھنے
لگی۔ اس کی موٹی موٹی تنگی پنڈلیاں اوپر سے سوئی سکڑ کے نیچے
بڑی خوبصورت نظر آ رہی تھیں۔

اپنی مٹی اور فریڈی کے ساتھ۔ میں نے اس کے الفاظ میں
طور پر کئے۔ ذرا دیر گزرنے کے بعد وہ بولی۔ اور۔ لیکن وہ تو
میرے مٹی اور فریڈی ہیں۔

اب وہ گلاب کی اس جھاڑی کے سایہ میں بیٹھ چکی تھی۔
مجھے یوں لگا کہ وہ روشنی کی دنیا سے نکل کر کسی اندر سے میں پہلی
گئی ہے۔ میرے اندر ایک بے چینی کا سا احساس پیدا ہوا اور
ہلاسی درجہ کے میں نے اسے آواز دی۔

میں تم کیا کر رہی ہو؟

کچھ نہیں مٹی۔

اب اندر آ جاؤ۔

اب مجھے جانا ہے۔ سفید اناظر۔ اس نے گلاب کی جھاڑی
کی طرف رخ کر کے کہا۔ اور گھر کی جانب چل آئی۔

میں تم وہاں کس سے باتیں کر رہی تھی؟ اس کے اندر گئے
پر میں نے پوچھا۔

میری سے؟

میری کون ہے؟

میں وہ میری نی ہے۔ اس نے بڑی مصورت سے جواب دیا۔
اس سے زیادہ اس وقت میں اس سے کچھ معلوم نہیں کر

سکی۔ چنانچہ میں نے اسے ٹیک اور ڈھونڈ دیا۔ جب وہ کھاپی
پہلی تو میں ایک کتاب میں سے پڑھ کر اسے کہانی سناتے تھی۔

کہانی سننے کے دوران وہ بار بار ہینچ کر جانب دیکھتی رہی، ایک
دفعہ تو اس نے شکوہ کیا تھا بھی لایا۔ آخر جب وہ لیٹر پیٹ

کر کوئی تو مجھے کھرا اطمینان ہوا کہ اب وہ محفوظ ہے۔
میرے شوہر ہم واپس گھر گئے اور میں نے انہیں اس

پڑا سرور، میری کے متعلق بتایا تو وہ ہنس پڑے اور لاپرواہی
سے بولے۔

تو اس نے یہ دلچسپ حرکتیں شروع کر دی ہیں۔

میں قہاراً مطلب نہیں بھیجی۔

مطلب یہ ہے کہ اس قسم کی حرکتیں کوئی غیر معمولی بات نہیں۔
جو بچے اپنے گھر میں اکیلے ہوتے ہیں اور جن کے ساتھ کھینچنے والا

کوئی نہیں ہوتا وہ مومنا اپنے لیے خیالی ساتھی پیدا کر لیتے ہیں بعض
بچے کو یوں کو پناہ ساتھی بنا لیتے ہیں اور ان سے باتیں کرتے ہیں

لیکن کس کو گھڑیوں کا بھی حقوق نہیں رہا۔ اس لیے اس نے ایک
خیالی ساتھی پیدا کر لیا ہے۔

لیکن اس نے خیالی ساتھی کے لیے ہی ایک نام کیوں چنا۔
تم جانتی ہی ہو کہ کچھ فکرت باتیں کس طرح پکھلتے ہیں۔

انہوں نے اپنے کندھے سے اچکاتے ہوئے کہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ
نام اسے کیوں پسند آیا۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ تمہاری پریشان تھا

ملا اور جربے۔ بالکل بے سبب۔
میں پریشان بالکل نہیں ہوں۔ میں اتنا ہے کہ اس کے لیے

میں اپنی ذمہ داری کو کچھ زیادہ ہی غصی کرتی ہوں۔ مگر وہ میری
حقیقی اولاد ہوئی تو شاید میں کچھ لاپرواہی بھی کر جاتی۔ مگر اب

نہیں۔
میں میں جانتا ہوں۔ لیکن وہ بالکل ٹھیک تھا کہ ہے۔ اس کا

خوبصورت صحت مند اور ذہین ہونا تمہاری تو جہ کا تبرج ہے؟
آپ کی تو جہ اور خیال ہیں تو اس میں شامل ہے۔

میرے تباہ کے لیے تم بہت اچھے مال باپ ثابت ہوئے ہیں؟
ساتھ ہی بہت سادہ اور نرم دلی بھی؟

تم دونوں ایک ساتھ تنہا پڑے۔ انہوں نے پڑھ کر مجھے
آغوش میں لے کر چم لیا۔ میری پریشانی گویا ختم ہو گئی۔

لیکن صرف دوسرے دن صبح تک کے لیے۔
اس دن بھی مجھ سے ہرے جہرے بانچہ اور سفید گلابوں

پر چمکدار دھوپ پھیلی تھی۔ میں نے دیکھا کہ کرشنا آگئی پانچ
مارے گھاس پر بیٹھی ہے اور گلاب کی اسی جھاڑی کی جانب دیکھ

کر رہی ہے۔
ہیلو وہ بولی مجھے امید تھی کہ تم ضرور آؤ گے۔۔۔۔۔ کیونکہ

تم مجھے اچھے لگتے تھے۔ تو تمہاری عمر کیا ہے؟ میں پانچ سال سے کچھ
ہی بڑی ہوں۔۔۔۔۔ مگر میں کوئی بچہ نہیں ہوں۔ میں جلدی سکول
جانا شروع کر دوں گی۔ اور ایک یا سبز لباس پہنا کر دوں گی تم کو

ہیں۔ یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی آواز میں کچھ ہٹ محسوس کی۔
تم انہیں جانتی ہو؟ وہی ڈاکٹر جو تین ان دنوں شمالی لاکر
دیا کرتے تھے جب تم بیمار تھیں؟

”جی ہاں۔ اچھا“

وہ ملاقات فل ڈاکٹر کے کہہ میں چلی گئی اور میں باہر انتظار
کرتے وقت کچھ بے چینی محسوس کرتی رہی۔ دواؤں کے پیچھے سے
ان کی گفتگو کی مدد کم آواز آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ کمرے
سے باہر نکلے تو ڈاکٹر نے کہا۔

”اسے قطعاً کوئی مار مار نہیں ہے۔ بس اتنا ہے کہ یہ نفی
گڑیا ایک مضبوط خواتین کی ذہن کی ملک ہے۔ اس نے اپنی آواز
ذہنی کے گھر سے کہا۔ آپ کے لیے میرا ایک مشورہ ہے سسر
اسے میری کے بارے میں کھلی کر باتیں کرنے کا موقع دیجیے۔
اس میں یہ اعتماد پیدا ہونے دیجیے کہ وہ اپنے آپ پر سروس
کرتے گھر یوں نگاہ ہے کہ آپ نے اس کے اس بھائی کو کچھ
نہیں کیا ہے اس لیے وہ اس کے بارے میں آپ سے زیادہ
باتیں نہیں کرتی۔ اس نے کرناٹ کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ وہ
تو غریب کے گھونٹے میں بننا ہے۔ ہے تاکر؟“

”جی ہاں میری کوئی کے گھونٹے بننا ہے۔“
اور وہ کچھ بڑھ نہیں سکتا ہے۔ ٹھیک ہے نا؟“
اور تیر بھی سکتا ہے۔ وہ بہت ہی اچھا بھائی ہے یہ کہتے
ہوئے غریب سے اس کا چہرہ دکھ رہا تھا۔

”میری اس کے لیے بہت اچھا بھائی ثابت ہوگا۔ اس کے
بال بھی کوس کی طرح ہی سرخ ہیں۔ ہے تاکر؟“

”جی ہاں۔ میری کے بال سرخ ہیں۔ اس نے فونکے ساتھ
کہا۔ بگڑیے بالوں سے بھی زیادہ سرخ ہیں۔ اس کا قد ڈیڑی
جتنا۔ اس وہ ڈیڑی جتنا ہے۔ وہ آپ جتنا لمبا ہے۔“ اس کی عمر
پچودہ سال ہے وہ کہتا ہے کہ وہ اپنی عمر سے زیادہ لمبا ہے۔ یہ عمر
سے زیادہ لمبا ہونا کیا ہوتا ہے؟

”اس کے بارے میں تمہاری بیٹی نہیں گھر جاتے وقت راتے
میں بتائیں گی۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ اچھا سسر۔ خدا حافظ گھر اپنے
نہیں۔ بس اسے خوب باتیں کرنے کا موقع دیجیے۔ خدا حافظ کوس

میری کو مبرا پیار دینا۔ کچھ دن اور اس طرح گزر گئے۔ اب تو

ان کی کس بزرگوں نہیں ہے۔ میرے علم میں ایسے بہت سے بچے ہیں۔
جن کے لیے ان کے خیالی ساتھی اس قدر حقیقی حیثیت اختیار کر گئے
تھے کہ ان کے لیے بڑھاپا ہو کر نہ گئے۔ کرناٹ جن کو انہیں کی طرح
تہنا اور اکیلے ہی ہے اس کے ساتھ کھینچنے والا بھی تو کوئی نہیں
ہے۔“

”جی ہاں۔ کوئی بھی پھر اس کا وقت نہیں ہے۔ آپ جانتے
ہیں کہ اس علاقے میں ہم ابھی تھوڑا سا صبر کرتے ہیں۔ مگر یہ
کی جلد ہی دور ہو جائے گی۔ جب وہ سکول جانا شروع کرے گی۔
اور آپ دیکھیں گی کہ جو بیٹی اس نے سکول جانا شروع کیا۔
اسکی یہ خیالی تخلیقات ختم ہو جاتی گی۔ فطری بات ہے کہ پھر
اپنے ہم ساتھیوں کی خواہش رکھتا ہے۔ ایسے ساتھی اُسے نہیں
میتے کہ انہیں خیالی طور پر پیدا کر لیتا ہے۔ آپ جانتی ہو گی۔
کہ پھر وہ لوگ بھی جو تہنا ہو جاتے ہیں اپنے آپ سے باتیں
کیا کرتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ پاگل ہو گئے ہیں بلکہ
ہمت کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی سننے والا نہیں ملتا تو اپنے آپ سے
باتیں کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ بچوں کا ذہن جو کچھ زیادہ ذہنیز
ہوتا ہے اس لیے وہ بجاتے خود سے باتیں کرنے کے خیالی
ساتھیوں کو تخلیق کر لیتے ہیں۔ اس لیے میرے خیال میں تو آپ
کے لیے پریشان ہونے کی قطعاً کوئی بات نہیں ہے۔“

”یہ بات میرے شوہر بھی کہتے ہیں۔“
”ان کی بات بالکل درست ہے۔ بہر حال آپ کرناٹ کو
ساتھ لاتی ہیں تو مجھے یقین ہے اس سے چند باتیں کرنے دیجیے۔
میں کرناٹ کو اپنے انتہائی گہری گئی تو وہ کوس کی قریب
کھڑی تھی مجھے دیکھتے ہی ہول۔“

”میری میرا انتظار کر رہے۔“
”کیا بیٹی؟ میں نے اطمینان سے پوچھا۔“

”وہاں۔ وہ گلاب کی بھاری کے قریب۔ اس نے سنبھ
گلاب کی بھاری کی جانب اشارہ کیا جو ڈاکٹر کے باغچہ میں بھی
موجود تھی۔“

”وہاں؟۔ وہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ میں نے باہر کی
جانب دیکھ کر کہا۔ اس پر اس نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے کوئی
بڑا آدمی کسی پر غصہ کر کر نظر ڈالے۔ ڈاکٹر وہی سسر سے ملنا چاہتے

”بچوں کے خیالی ساتھیوں کا ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے اس
طرح بچوں کو بولنا خوب آ جاتا ہے۔ اب کوس پہلے کی نسبت زیادہ
بے تکلفی سے بول سکتی ہے۔“

”مگر ایک خاص اجڑی میں نے دیکھا تھا۔
خاص اجڑی؟ کس خاص اجڑی میں؟“

”آپ نے دیکھا نہیں۔ اس کا بوجھ مایا نہیں۔“

”لیکن جان کن۔ شہر میں رہنے والا ہر بچہ کسی دیکھی حد تک
اس بوجھ کو لانا پاتا ہے۔ اچھی کیا ہے۔ اس کا حال تو اس وقت
دیکھنا جب وہ سکول جانا شروع کرے گی اور وہ سوسے بکوں
سے اس کا بول بول رہے گا۔“

”مگر وہ تو کوس میں سے کسی کا بوجھ نہیں ہے۔ پھر اس نے
اجڑی سے یہ بوجھ کہاں سے لیا۔ اس کے بکوں سے کتنی بے ہوشی
ہی۔۔۔۔۔“

”سیکھیں کیا اس سے آخر وہ وہ فائدہ معافی کونے والا۔ کون
دینے والا۔ بچوں والا۔ سب گھر میں آتے ہیں یا نہیں۔ اس کے
بعد بھی کچھ کسرتی رہ جاتی ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ بڑے لوگ اس کی وجہ نہیں دیکھیں۔ میں نے بڑی
گہری کے ساتھ ہنسی۔“

”تمہاری سسر اور ذہنی اطمینان کے لیے میں نے ایک تدبیر
سوچی ہے۔“
”کیا۔؟“

”تم کوس کو کس ڈاکٹر وہی سسر کے پاس چلی جاؤ اور اسے
کوس کے ساتھ باتیں کرنے کا موقع دو۔“

”کیا آپ مجھے میں کہ وہ ذہنی طور پر جواب دے۔“

”خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔ انہوں نے اطمینان سے کہا۔ لیکن
جب کوئی ایسی بات سامنے آ جاتے کہ بھاری مجھے بالآخر تو
ماہر اندر مشورہ لینا بہتر ہو سکتا ہے۔“

”دوسرے دن میں کرناٹ کو کوس کو میرے گھر کے پاس بھیجی دے
انتظار کے کوس میں چھوڑ کر پہلے ڈاکٹر کے اکیلے میں اور اسے تھوڑے
میری کے بارے میں بتایا۔ ڈاکٹر نے جلد ناز انداز میں سرجھٹتے

ہوئے کہا۔“

”سسر۔ یہ کیس اگرچہ بڑا غیر معمولی ہے لیکن اپنی ذہنیت کا

جانتے ہو یا نہیں؟۔ پھر تم کیسا کہتے رہتے ہو۔ اس کے بعد وہ
خاموش آنکھ کے ساتھ مجھے کھنکھن کر رہی۔

”میں بوجھ کی خاندانی گھر کی میں دیکھ کر غصے سے جیسے ٹل رہ
گئی۔ میں نے مجھے آپ کو کھانے کی کوشش کی کہ یہ خوف مت ہو۔
بہت سے بچے اپنے لیے خیالی ساتھی پیدا کر لیتے ہیں۔ تم بولیں کچھ
کچھ بھی نہیں بولنا ہے۔ اچھی نہ ہو۔“

”لیکن اس کے باوجود ناشر اور کھانے کے درمیان دودھ
پینے کے لیے میں نے کوس کو وقت سے پہلے ہی پکارا۔“

”کیا میری کو کبھی ساتھ لے آؤں؟ اس نے مصروفیت سے
پوچھا۔“

”جیسے میں نے جارا اور دیکھ گئی کے ساتھ کمر دیا۔
خدا حافظ میری مجھے اس کی سسر نہیں اپنی ساتھ نہیں

لے جاسکتی۔ مگر مجھے دودھ پینے کے لیے جانا چاہیے۔ یہ کہ کمرہ
گھر کی جانب دھڑکی۔ مگر میری کو دودھ کیوں نہیں مل سکتا؟۔“

”اس نے اٹھتے ہی پوچھا۔“
”یہ میری کوس ہے بیٹی؟ میں نے بارے سے اُسے پکارا۔“

”وہ میرا بھائی ہے۔“

”لیکن کوس، تمہارا تو کوئی بھائی نہیں ہے۔ تمہارے اس
بچے کے ہاں تو صرف ایک بچہ ہے۔ ایک بھائی ہی لڑکی گڑیا ہی

میری ہی بیٹی۔ اور وہ تم ہو۔ میری تمہارا بھائی کیسے ہو سکتا ہے؟
”میری میرا بھائی ہے۔“ اس نے خود مجھے بتایا۔“

”اس کے بعد وہ دودھ کے گلاس پر جھک گئی۔ اسے غم کے
دودھ کی سیرنگوں کے واسطے ہونٹ سے ہی دیکھ کھانے لگی۔“

”اور میں نے سہارہ میری نے اس کی جھوک پر میرا حال کوئی بڑا
اثر نہیں ڈالا۔“

”اس دفعہ کے واقعہ کا میں نے مجھے کوئی ذکر نہیں کیا میں
نے سہارا کوس کے کمرہ پہلے کی طرح میرا مذاق بگڑا۔“

”لیکن کرناٹ کی بھاری دن دن اتنی اہمیت اختیار کرنا گیا کہ
مجھے کچھ کہہ دے اس پر سوار ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ اصل ہیڈ

وقت گزرتے کے ساتھ بڑھتی جا رہا تھا۔“

”ایک گھر کو مجھے نے کرناٹ کو اس طرح میری سے باتیں
کرتے نہ سنا کئے۔“

ہر وقت ہر طرف ہیری ہی ہیری تھا کرستان ہر وقت اسی کی باتیں سنایا کرتی تھی۔ آخر جب اس کے سکول جانے کا وقت آگیا تو سکول جانے سے ایک دن پہلے وہ کہنے لگی۔

”سکول نہیں جاؤں گی۔“
”وہ کیوں بیٹی۔ تم تو سکول جانے کی تیاری کیا کرتی تھی۔“
”نہیں بیٹی! تم سکول جاؤ گی۔ وہاں تمہارے پیچھے اور بھی بہت سے بچے ہوں گے۔“

ہیری کہتا ہے کہ وہ سکول نہیں جاسکتا۔
”وہاں نہیں اور بہت سے ساتھی مل جائیں گے اور ہیری“
”میں نے تو کڑی جدوجہد کر کے یہاں آئی ہوں۔ ہیری کے وجود کو تسلیم کرنے کی کوشش کی۔ ہیری بیت بڑا سہلہ وہ جیسے جیسے بچوں میں اچھا معلوم ہو گا۔ وہ تو ماسال کا اچھا خاصا جوان ہے۔“
”میں ہیری کے لیے سکول نہیں جاؤں گی۔ میں اس سے الگ نہیں رہ سکتی۔ اس نے میری سچ کر کرنا انڈاز میں دیا شروع کر دیا۔“

روستے روستے وہ سو گئی۔ آنسوؤں کے نشانات اس کے خوبصورت چہرے پر اب تک جیسے جیسے تھے۔

ابھی دن کی روشنی باقی تھی میں پردے کھینچنے کے لیے کھڑی کے قریب تھی۔ بچوں میں ہنری دھوپ اور دم سالوں کا احتیاج بڑا اور قریب لگ رہا تھا۔ میں اسے دیکھنے میں غور ہو گئی۔ اچانک مجھے لول لگا کر سیدھا گلاب کی چھائی کے قریب ایک ڈبے پر بیٹے کے قدم کے لڑکے کا سایہ واضح طور پر میری آنکھوں کے سامنے تیر گیا۔ میں نے جھٹ کھڑی سے سر نہ اٹھا اور میرا روی طور پر پکار اٹھی۔

ہیری۔ ہیری۔

مجھ لول لگا کر گلاب کے سیدھے لول کے درمیان کوئی شرمیلہ پیر ایک طرے کے لیے جھلکی۔ ایک لڑکے کے سر کے گنگھیلے سر پر بال، لیکن ایک جھپٹنے کے ساتھ ہی وہ بال کھینچنے لگا۔ جیسے میں نے خواب میں سب کچھ دیکھا ہو۔

اس وقت میں شاید ساری رات ہی اس معاملے پر سوچتی رہی۔ بال لگتا تھا کہ میرے شوہر کی اکثر وہ پیش پا کوئی بھی شخص ہرے قلب و دماغ کی کیفیت کو سمجھنے کے قابل نہیں ہے اور اپنی

المن کو جس میں خوف کا عنصر بھی شامل تھا۔ ڈر کرنے کے لیے مجھے فوری کچھ کرنا پڑے گا۔

چنانچہ دوسرے دن میں اپنے اس خفیہ کام کے لیے دروازہ ہو گئی جس کا ذکر میں نے کسی سے بھی نہیں کیا تھا۔ کرستان کو سکول میں چھوڑنے کے بعد ایک بس میں سوار ہوئی اور شہر کی اس بیرونی آبادی کی اس بلند بوسیدہ سی چار منڑا مارت کے سامنے بیچ گئی جہاں پانچ سال پہلے میں اور ہم آگئے آتے تھے سب سے اوپر والی منزل پر آ گئے۔ یہو دلا وارث بچکان کا دفتر تھا میں ایک ہی سانس میں اس کی ان گنت سیر حیاں ملے کوکے اپنے جانے پہچانے دووانے پر پہنچ گئی اور دنگ دینے لگی۔ دروازہ کھلیا اور نہ کھولا۔ وہ لایسہ قدم قید بانوں اور ہر لول بھرے مشفقانہ چہرے والی خاتون تھیں۔ انہوں نے بڑی دلاوری سے اس کے ساتھ میرا تیر مقدم کیا اور کہا۔

”اودہ سیزم۔ آپ کی طرف سے آوری بڑی خوشی کا باعث ہے۔ کرستان کا کامیال ہے۔“

”وہ بالکل خوش و خرم ہے۔ میں نے ایک کرسی پر بیٹھ کر دیکھا۔ میں ڈراما میں ہوں۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ یہ کسی قیدی کے طلب کی بات کرنی چاہیے۔“ وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھی برقع مزین تھیں۔ میں کیلور بات سے کہنے معلوم ہے کہ آپ لوگ کوما کی بچہ کو گود لینے والوں کو اس کے والدین کے پاس سے اور اس کے والدین کو اس گود میں لینے والوں کے متعلق کچھ نہیں بتاتے۔ لیکن کرستان کے متعلق مجھے مزید معلوم

مشتعل ہو کر مانتی اس خزانے کو بتا رہا تھا کہ ”حقائق کی دریافت کرنے کے لیے مددگار بہت ہوتا ہے۔ اس موضوع پر میری تحقیقات ہو رہی ہیں اور کوہ اس میں نہیں تھا کہ آئے دن میں ان کی تحقیقات سے مانتی کی زبانیں کیا اٹھ رہی ہیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے فرات سے سرائی کیا ہے۔ چھٹی سی تحقیقات سے پہلے قائم ہے۔“
فرات سے کونسا آیا۔ اس نے دریافت کیا۔ میں نے کہا کہ میں نے جو مانتی مانتی ہے۔ یہاں پر ہے۔ اس سے میں کیا فائدہ پہنچا ہے؟

جو پتا چاہتے کہ وہ کون ہے؟

مجھے افسوس ہے سیزم۔ انہوں نے کہا شروع کیا۔ ہمارا اصول.....

”پہلے مجھ سے ساری بات سن لیجیے۔ میں نے ان کی بات کا۔ اس کے بعد آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ میں حصول قسم کے تجسس کا شکار نہیں ہوں۔“

اس کے بعد میں نے تفصیل کے ساتھ کرستان کی یہی کہانی انہیں سنائی۔ وہ خاموشی سے سنتی رہیں اور ان کے چہرے پر حیرانی کے آثار چھلکتے گئے۔ میں نے اپنی بات ختم کی تو وہ بولیں۔
”یہ تو بڑی عجیب کہانی ہے۔ بہت ہی عجیب۔ سیزم اس کا سبب سننے کے لیے کہہ دیتے ہیں۔ اصل کو تو تو بتا رہے ہیں لیکن یہ خیال دیکھ کر کرستان کے گھراور والدین کے بارے میں جو کچھ میں بتاؤں وہ صرف آپ تک محدود رہنا چاہیے۔“
”یقیناً۔ آپ بالکل مطمئن رہیں۔“

”وہ لڑکے کے ایک بہت ہی عجیب خدشہ پیدا ہوئی تھی۔ انہوں نے بتانا شروع کیا۔ اس کا خاندان چار افراد پر مشتمل تھا۔

”ابا، ایک بیٹا اور کرستان خود۔“
”ایک بیٹی بھی۔“
”ہاں سب یہ واقعہ ہوا تو اس کی عمر چودہ سال تھی۔“
”کیا واقعہ؟ کب ہوا؟“

”میرا خیال ہے کہ شروع سے آپ کو بتا دیں اصل کرستان اپنے ماں باپ کا چھوٹا بچہ تھی۔ باپ کے ماں باپ ایک بوسیدہ اور پرانے مکان کی سب سے اوپر کی منزل کے صرف ایک کمر میں رہتے تھے۔ تین افراد کے لیے ان کے پاس جگہ اور ذرائع ناکافی تھے۔ اس پر یہ مجھ پر مہیا ہو گئی۔ یہ تو بڑی مشکل و پریشانی تھی۔ اس کی ماں کچھ پریشان سی رہتی۔ بڑے متعلق رہنے والی بہت مومن عورت تھی۔ کرستان پیدا ہو گئی تو اس نے اپنی بیٹی کو بے قیامتی کا شکار کر دیا۔ مگر کرستان کا بھائی اپنی بہن کے ساتھ شروع سے ہی بہت ہیاد رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے اس کی دیکھ بھال کی ذمہ داری کو نبھانے کے لیے سکول جانا ترک کر دیا اور اپنے تعلیمی مستقبل کو قربان کر دیا۔“
”کسی طرح کے ہی اس حالت کی نقل منزل میں رہنے والی۔“

ایک عورت کو یوں لگا کہ اس کی کھڑکی کے سامنے ادھر سے کوئی چیز دھماکے کے ساتھ گری ہے۔ وہ عورت فوراً باہر پھٹی تو دیکھا کہ کرستان کا بھائی زمین پر پڑے اور کرستان اس کی گود میں بے تحاشی کی گود میں لٹک رہا تھا اور وہ ہر چہ تھا۔ کرستان کا چہرہ بھی نیلا پڑ گیا تھا مگر اس کی سانس اب تک آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔

”اس عورت نے اپنے گھر کے لوگوں کو جگا کر پولیس اور ڈاکٹر کو اطلاع کرائی اور ان کے آنے کے بعد وہ سب اوپر کی منزل پر پہنچے تو کرستان کے گھر لے کر آکر اندر سے بند تھا۔ اسے تو دیکھ کر گھولا گیا تو اندر گیس کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔ خاندان اور بیوی دونوں بہتریں زخم بردہ پڑے تھے اور خاندان کے ہاتھ کی کمی ہوئی ایک خیر مزیر ہو جو دھبی میں لٹکا تھا۔“

”زندگی اب ناقابل برداشت ہو چکی ہے۔ میں سب کو رہا ہوں۔ اس کے علاوہ کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔“

”پولیس اس تجویز پر پہنچی کہ بیوی بچوں کے سامنے کے بعد اس شخص نے دروازہ اور کمرے بند کر کے گیس کی نالی سکول دی اور خود بھی اپنی بچی کے قریب بستر میں لیٹ گیا اور پھر موت کی آغوش میں گھس گیا۔ اسی دوران میں اس کے لڑکے کی آنکھ کھل گئی ہوگی۔ وہ دروازہ کھولنے اور کھینچنے کی کوشش میں ڈھاکام رہا اور آٹو آخری کوشش پر کی ہوگی کہ کھڑکی کھول کر اپنی بہت بیماریاں

”میں کو گود میں لیے ہوئے تھے چھلانگ لگا دی۔“
”گرا بھائی نے بہن کو ہانپنے میں اپنی جان گنوا دی۔“

”یہ شک وہ بڑا ذریعہ رکھتا تھا۔“
”میرا خیال ہے کہ وہ بہن کو ہانپنے کی نیت سے اپنے ساتھ رکھے کا زیادہ خواہشمند تھا۔ میرا خیال ہے کیلور۔ اس لڑکے کا کیا نام تھا؟“

”اس کے لیے تو مجھے اپنے کاندھ دیکھنے پڑیں گے۔“
”انہوں نے الماری میں سے کئی ٹائیس اٹھا کر ان کے کاندھ کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ آخر ایک ٹائیل کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

”اُن کا خاندانی نام جونز تھا اور یہ چودہ سالہ میرا لڑکا تھا۔“
”کیا اس کے بال سرخ تھے؟“
”ہاں بالوں کا کچھ سرمیلہ ہے۔“

گئے..... لیکن آپ کی طبیعت تو خشک ہے؟ اس نے مجھے
نور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

• ہاں میں خشک ہوں مجھے گھر پہنچنا پڑا ہے،
گرمی سے جلنے ہوئے راستوں پر میں ہر جگہ حسی کے عالم میں
بھاگتی ہوں گھر پہنچتی۔

• کرس۔ کرسٹائن۔ کہاں ہو تم کرس۔ کرسٹائن؟
• کرسٹائن۔ کرس۔ تم کہاں ہو۔ کرس۔ تم تو بڑی نہیں۔ کرسٹائن۔
بیری اسے مت لے جاؤ۔ مت لے جاؤ اسے واپس کر دو۔
بیری... بیری... چلے سے رہی۔

اس طرح چمپن ہوئی میں گریا پاگل ہو کر باغیچہ میں نکلی
سوئی کی بڑش میں بڑے کی طرح میرے بدن میں آڑ لگیں۔
سید گلاب دھوپ میں چمک رہے تھے اور فضا مائل مسکات تھی۔
پچھلے یوں گلاب سنیسیا ایسا جگہ پہنچ گئی ہوں وہاں دوست چمک رہی

ہے۔ ایک ٹوکے میرے یوں غم میں ہر اکریں کرسٹائن کے سامنے پہنچ
گئی ہوں لیکن اسے چمک نہیں سکتی۔ اس کے لیے گلاب کے
پچھلے میرے چاروں طرف تاج ایسے بڑے شہر گلاب کے پچھلے۔
سرخ چمک۔ سرخ۔ سرخ۔ پھر سرخی سیاہی میں تبدیل ہوئی
پلی گئی سب کچھ باہر ہو گیا۔ گلاب اندر آکر کچھ بھی نہیں سب کچھ
مت گلاب میں خود بھی۔

میں ایک ہنسنے پکار رہی بیری بیماری نے ذہنی شکن اور
اصلاحی دباؤ کی شکل اختیار کر لی۔ اس دوران میں ہم اور لوہے نے
ٹی کر کرسٹائن کی تلاش میں شہر کا کچھ چھپ چھان مارا۔ لیکن کرسٹائن
کو نہ ملنا تھا نہ ملی۔

اصل واقعہ کا کم صوفت دو افراد کو ہے۔ ایک کھنڈر جیسے مکان
میں رہنے والی پاگل عورت کو اور دوسرے مجھے۔

اس بات کو کئی سال بیت چکے ہیں۔ لیکن خوف کے سامنے میرے
دل پر بدستور ہر صوفت چھانے رہتے ہیں۔

اور میں بڑی مولی چیزوں سے خوفزدہ ہو جاتی ہوں۔ چمکار
دھوپ۔ گھاس پر پڑنے والے گبرے سامنے۔ بقیہ گلاب۔

سرخ ڈاؤر اواسے پچھتے اور۔ اور ایک معمولی سامان۔ اپنی۔
بیری۔ بھو۔ یہ تو ضرورت چیزیں ہیں خوفزدہ کرنے والی جو
کتنی ہیں۔



خواب میں انہیں گھٹ گھٹ کر بھاگنے کی کوشش کر رہی ہوں۔
سوچ رہی ہوں کہ تانی کے ساتھ میں میرے سر پر چمک رہا
عنا لیکن مجھے اس کا کوئی احساس نہیں ہوا۔ میں تو گریبان کھان
کے تمام احساسات کو بھیجی تھی اور گرتی پڑتی شکل سے آگے بڑھ
رہی تھی۔ اپنا ایک ایک آواز سے میری ہونٹوں اور میرا خون خشک
ہو کر رہ گیا۔ قریب ہی کسی گھر کی دیوار تھی۔ جہانے تھے۔

اب کیا کروں؟ اب کیا کروں؟ اب کیا ہو گا۔ میں پستانیں شہر
کے کسی حصہ میں ہوں؟ سکول چلنے وہاں سے کتنی دور ہے؟ معلوم
تھیں وہاں لوگ کیسے ہیں جہانے کی؟

میں نے سنت گھبراہٹ سے چمکی اور اضطراب کے عالم میں ہر
آہ بھانے والے سے طرح طرح کے سوال کیسے شروع کر دیے
وہ کچھ ایسی خوفزدہ نعروں سے دیکھتے گئے۔ جس طرح میں نے اس
پاگل عورت کو دیکھا تھا۔

آخر مجھے یوں ہی گئی اور گرد و منڈار پتھروں کی بو اور خوفزدگی
سے متلا ہوئی میں سکول تک پہنچی۔ کھیل کے وسیع میدان کو بھاگتے
بچے اور کھیل کے انداز کی حماقت کے کڑے میں پہنچی تو میرا سامنے ایک بو
بھرا بھرا سیدھا کس میں غم میں لوہوں اس کی اپنی کاپیوں اور
کچھ کھیلوں کو اکٹھا کرنے میں مصروف تھی۔

• کرسٹائن کی گھر کیلے آئی بڑی۔ میں اس کی ذرا۔ بڑی۔
• جہانے میرے درجہ ہوئی۔ وہ کہاں ہے؟ میں نے اپنے بڑے کہا۔
• کرسٹائن تم؟ اس نے سنا ہی نہ تھا۔ میں نے کہا کہ وہاں اور فریڈ
پچھلے ہوئے ہیں۔ وہ۔ ہاں مجھے یاد آیا۔ وہ چھوٹی گڑیا سی۔

میں نے اس کی تلاش میں گھبراہٹ میں۔ جرم اس کا بھائی
میرے لئے آگیا تھا۔ میں میں بھائیوں کی کچھ نہیں۔ بڑی۔ میں نے
تو کچھ یاد گئی اور ان کا آگے میں کھنڈر پار ہے۔ اس طرح کے لڑکے کو
پلیٹی تھی جس میں کو اختیار کرنے دیکھتا ہوا اس روح پرورد ہے۔

بھائی نے مجھے آپ کے شو میرے بال سرخ ہوں۔ دووں پچھلے کو
یہ دوستی اسی سے ملے ہے نا؟

• جی۔ کے بھائی نے کہا۔... کہا۔ میں نے بھائی
بھائی۔ تم کو چاہیے؟

میں نے بات تو کوئی نہیں کی تھی۔ اس سے بد
چھوڑ سکا کر رہ گیا۔ میرا خیال ہے اب تک۔
• شمع کے یوں

گلاب کی بھاڑی میں۔ اب وہ یہاں آ کر رہے ہیں۔ اسے دیکھ
کر لی ہوں اپنی بہن کو پانے لغزہ کہیں نہیں جاسکتا۔
• کرس۔ آگے کس کے متعلق بتا رہی ہیں؟

• میری جو لڑکے کے پاس ہیں وہ۔ اچھا لڑکا تھا۔
• سرخ بالوں والا۔ دلا پتلا لڑکا۔ بڑے بڑے سرخ سر کا۔ سہ
جو سوچ لیا تھا اس پر عمل کر کے رہنا تھا۔ کرسٹائن سے شدید محبت
کرنا تھا۔ گلاب کی بھاڑی میں گر کر مر گیا۔ کرسٹائن کو لے کر ان
پھولوں کے پاس پہرے پشمار رہنا تھا۔ موت میں لے کر آئی
مگر کیا لوگ مر رہے ہیں۔ اس سوال کا جواب پادروں کو دینا
چاہیے لیکن وہ کچھ نہیں بتاتے۔ کون کس کا پتہ نہیں ہے۔ مگر مگر تم
یہاں کیوں آئی ہو جہانے۔ ہاؤز نمبر کی جگہ نہیں ہے۔ یہ ان لوگوں
کی جگہ ہے جو سنے کے بعد نہیں مرنے اور روزنہ رہ کر رہیں نہیں
ہیں۔

اس کے سید بکھرے ہوئے بالوں کے نیچے سے گھوٹی ہوئی
جنوں آنکھوں سے میں خوفزدہ ہو گئی۔ ہاں لوگ بھی عجیب ہوئے
ہیں۔ انہیں دیکھ کر دم اور ہمدردی کے جذبات ابھرتے ہیں لیکن
خوف اس قدر محسوس ہو کر کہ وہ سب کام جہانے پر نااہل کہلاتے۔
• اچھا تو میں جانتی ہوں خدا حافظ۔ میں نے منہ سے جہانے کی
اور بھل کر جاری داپس ہو کر مجھے قدم بھرنے لگی۔ میں نے یوں دیکھا
مجھے ہڈوں ایک ایک کس کے جو گئے ہیں اور مجھے میں کی ضرورت



• مگر کرسٹائن اسے بیری کہتی ہے۔ ربات بھی کھدش نہیں
آئی کہ اسے اپنا بھائی یاد کیے رہا جبکہ اس کی موت کے وقت وہ
چند ماہ کی تھی۔

• بات ہے تو بڑی اچھی ہوتی مگر میرا خیال ہے کہ کرسٹائن کے
فحش الطور میں بیری کا فتنہ جو سنا ہے وہ اس کے انتہائی
بچپن کا سامانی تھا۔ ہم جیسے ہیں کہ بچوں کا حافظہ دیر پا نہیں ہوتا
لیکن ان کے ننھے ننھے ذہنوں میں بھی ماضی کے کچھ لمحوں باقی رہ
جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ بیری بھی کرسٹائن کی تخلیق نہیں ہے بلکہ
اسے اپنا بھائی اس حد تک یاد ہے کہ وہ اسے دوبارہ حقیقت کا
روپ دے رہی ہے۔

• کیا آپ مجھے اس مکان کا پتا بتا سکتی ہیں جہاں یہ غامدان رہتا
تھا؟

• ہاں ہاں۔ کیوں نہیں؟ میں کلور سے پتلے کر جیسے میں اس
مکان پر پہنچی تو وہ ایک کھنڈر سے زیادہ کچھ نہیں تھا اور اسے
لاوارث چھوڑ دیا تھا۔ البتہ ایک ایسی چیز فکر آتی ہے جس میں دھنکی
ہی رہ گئی مکان کے ساتھ ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ میں میں کھیل گئی
چمک دارا ہوا گھاس کے نیچے لہرا رہے تھے اور اس باغیچہ میں
ایک ایسی آواز کئی خوش صورت چیزوں کی جیسے بھول کی جیسی کے
کسی مکان میں نہ ہوگی۔ بھائی گلاب کی ایک بھاڑی تھی۔ کرسٹائن
ہویم۔ یہاں کیا کرنے آئی ہو؟ میں اس آواز سے چمک پڑی۔
• دیکھا تو ایک عورت مکان کی چلی منزل کی ایک کھڑکی سے جھانک
رہی تھی۔

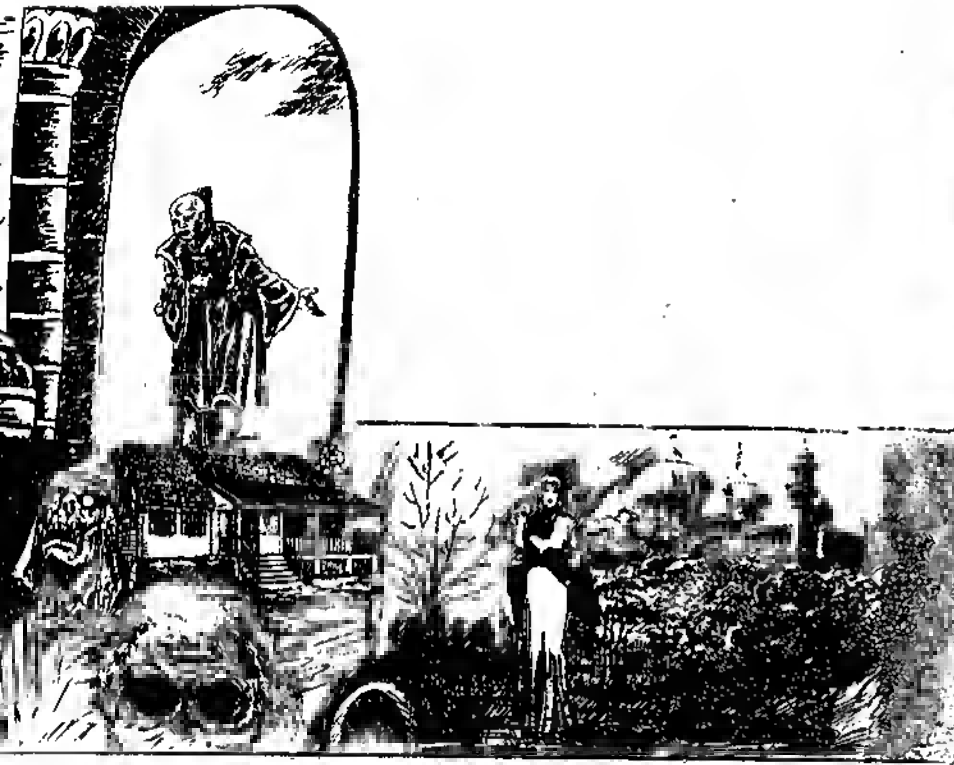
• میرا تو خیال تھا کہ اس مکان میں کوئی نہیں رہتا۔
• جی تو ایسا ہی چاہیے۔ اس کو نا کارہ اور خطرناک قرار دے
دیا گیا لیکن مجھے یہاں سے کوئی نہیں نکال سکتا۔ کوئی جگہ نہیں
جہاں میں چل جاؤں۔

• اس واقعہ کے بعد سب لوگ مکان چھوڑ گئے۔ اب یہاں آنے
کے لیے کوئی تیار نہیں ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ مکان آسپ زندہ ہے۔
جو کہنے سے مگر جھکا آگاہ ہے۔ موت اور زندگی میں فرق کیا ہے
مگر یہ حقیقت بڑھ چھا ہونے کے بعد معلوم ہوئی ہے۔ اس نے مجھے
اپنی فردی مائل سرخ آنکھوں سے گھورتے ہوئے کہا: میں نے اسے
اپنی کھڑکی میں سے گرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ اس جگہ گرا تھا جہاں

ناجی کھوپڑیاں

پراسرار کہانی

فوزیر نے پچھا پچھا آنکھوں سے کسی کی طرف دیکھا،
اس کا رنگ زرد پڑ گیا، کسی پر فوجیوں کے بجائے
ایک خوفناک بلا بیٹھا تھا۔



گر میوں کا موسم تھا، اس صبح کے کہ دروازہ لیت نامی گاؤں میں، جی کے لئے قسمت کوئی کوڑے مارے تھے، جین کوئی تیار
ہو چکے تھے اور ان میں صرف برقی موڑیں لگائی باقی تھیں۔ وہ سبہ قطعے میں صرف نصبت گھنٹہ رہتا تھا چند مزدورں کا خیال تھا اس
عقبر سے وقت میں کسی کوئی میں وقت درضرب کرنے کا کام شروع کیا، تو احوار دہاڑے لگا، اس لیے باقی وقت آرام کرنا ہی ہے
گراؤں تک تو مستعد بہت قسمت مزدور سے کہا، ہیں وقت مناس کرنے کے بھائے پوتا کنواں کو دنا شروع کر دینا چاہیے تجربہ مسئل تھا
قام مزدورں سے کہہ کر اس سال لیے اور نشان زدہ زمین کوڑے لگے وقتے لاگنڈ بجا، تو وہ دس فٹ گہرا گڑھا کر دیکھے تھے انہوں نے
آپس ایک دوسرے سے دیکھ کر ہنس پڑے، ایک نے مزید بولی چاکے ہم سے شور تھا، وہ بہت قسمت مزدور کا گہرا دست تھا کینٹین کے پاس
چرا کر اس کی ٹانگیں اپنے دوست کو تاش کرنے لگیں، مگر وہ کہیں نظر نہ کیا، مالی چانے دوسرے مزدورں سے پوچھا، گورہ کوئی ہوا بیٹے



عہدہ کے لئے منتخب ہوئی اور پھر وہ کنوئی کی طرف ہذا قریب پہنچا
 تو کنوئی میں کھال پہنچنے کی آواز سنائی دی، اس لئے اس نے مہاجر گیا۔
 قریب پہنچ کر دیکھا — مزدور پہنچنے میں شراور اور کھال چلا رہا تھا۔
 ان کے منہ سے کچھ کچھ کھانسی کے شہس نہیں، لیکن انے کا وہ تھوہر
 پڑا ہے۔ مال بچا ہوا۔

تھپا، تم چلو میں یہ ذرا سہستہ کھو کر میں ابھی پوچھتا ہوں؟
 بہت قناعت مزدور نے جواب دیا۔ مالی چھا چنڈے وہی کھڑا
 لینے ساتھی کی کام سے ملنے پر رشک کرتا رہا، چھوٹے بین کی طرف
 چل دیا۔ ابھی چنڈی قوم آگے رہا تھا کہ ایک دلدرد بچہ سنائی
 دی، مگر اس کے لیے تو وہ کھٹے میں آگیا، پھر اپنے آپ پر ت
 پاتے ہوئے نکلا، اسے یقین تھا کہ جتنے کنوئی سے آئی ہے وہ
 دوزخ کنوئی میں پہنچا، اندھا جاگ کر دیکھا، تو اس کے ہم پر لڑنے
 طاری ہو گیا، بہت قناعت مزدور زمین پر پڑا رہا، قناخوں کا
 ایک فوارہ اس کے ماتھے سے ابھر رہا تھا۔ مالی بچا کنوئی میں آکر
 گیا، مگر اس کے پیچھے ملک مزدور کی طرح قنصن مٹھری سے
 بھڑا کر گئی۔

مزدور کی ناگمانی موت کی خبر آنا تھا تاہم اس طرف پہل
 گئی۔ کنوئی کے گرد مزدور دیل اور دوسرے کارگردی کی مہر لگ
 گئی، شام گئے تو میں بھی ویتہ مہارات پہنچ گئی، ابتلائی مسافے
 کے بعد میں اپنے گھر پہنچنے پر روتی تیار کی، اس کے مطابق زمین
 کے اندر کوئی طوفان تیز تیز تھی، توئی ایک تونڈ آدی تھا، اس نے
 کھال چنڈی قوت سے زمین پر ہادی، کھال طوی چیز سے کھرا
 کر اسی رفتار سے ابھی اور مزدور کی پیشانی میں ملک کنوئی اور دوزخ
 نے اسی وقت دم توڑ دیا۔

کھال کی کاٹھنک گیا مزدور میں سر کی پھیل گئی اور
 وہ کیسب سے جاننے کی طرف میں ملک گئے، بہت تیز کو خبر دی،
 تو بہت پریشان ہوا مزدور دل کے پاس پہنچا، میں کھال بچا
 گھر پہنچا، بالآخر میں نے دلو ڈالا اور وہ کام پر آنا ہو گئے۔

ابتر شراور میں ایک کوئی تھوہر میں حیدر کھال نہیں کر رہی تھوہر
 ہاتھس قناخوں کی آواز سن کر وہ ملک سے انجمن بہت انجمن کے
 بس میں رہتا تھا، چنانچہ میں نے چند مزدور دل کوئی تھوہر میں
 زبردستی آنا دیا۔ دو مزدور دل سے اس جگہ کھال پہنچنے کے
 جہاں ملک کے ساتھی کی موت واقع ہوئی تھی، تھوہر کی دیر میں
 ان میں احساس ہوا، کھال نرم مٹی کے بجائے کسی مٹھی پر سے
 ٹھوہری ہے، خوف و ہشت کی طرح اس کے جسم میں دوزخ گئی، مگر
 پولیس کے دکانیٹیل ان کے سر پر کھڑے تھے وہ جیسے تیسے
 کھال چلائے، سب مٹی کھال دی اور تھوہری دیر بعد ایک مرتبہ تیز
 چیر و زبانے مٹی کی چیز ان کے ایک ساتھی کی موت کا باعث
 ہوئی تھی۔

یہ سب کی کوئی یاد رکھنے کے دوزخ مندرق تھا، ایک
 بڑا سا آلا اس میں لگا ہوا تھا، جیت انجمن مندرق کی دریا نیت
 پر پھر لکھا تھا، اس نے مزدور دل کو کم دیا، مندرق کے سبب دلوں
 طرف سے مٹی کھو کر اسے باہر نکالیں، مزدور دل نے مٹی کی تھیل کی۔
 مندرق کے گرد گرد بڑا لگا رہا تھا، اب مزدور دل نے مندرق پر
 ٹھانے کے لیے مندر لگایا، مگر کام ہے، یوں گھٹا تھا اس کے خاص
 سالے کے دیکھنے زمین کے ساتھ چپکلا دیا گیا ہے، ایک مزدور نے
 تھوہر میں مٹی، مندرق کو باہر نکالنے کے بجائے بالائی سطح کی
 ریت اور مٹی کو دیکھ دیا، اسے تاکہ آلا قوت سے جو مندرق آ
 ڈھکنا کھو ہا سکے۔ تھوہر مٹی تھی، مندرق کے اوپر سے ریت
 بٹا دی گئی، سب آلا کھول باقی تھا، رنگ آلود اور مٹی بھری گم
 کا آلا ایک ہی طریقے سے کھولنا ہوتا تھا، یہ کہ اسے تیز دھڑ
 کی کھال سے توڑ دیا جائے، مزدور دل بہر شقت سے شک
 کر پھر پوچھنے تھے، اس لیے یہ کام ایک تونڈ کاشٹیل کے بہرہ
 کیا گیا، کاشٹیل پہلے تو میں دیکھ کر آنا، بڑا پیکر دے کم کے
 آگے چلا گیا۔

اس نے کھال اٹھائی اور اسے بہرہ میں لگانے لگا، وہ پانچ

منٹ ملک پڑی قوت سے تاکے بہرہ پر غریب لگا، تاہم پہلے
 میں شراور ہو گیا اور اس کی بہت جواب دینے کی، مگر ایک غریب
 ایسی ہی کی کو رنگ آلود آلا دوزخ سے ٹوٹ گیا، پولیس انجمن
 بلکنا کر بڑھا، کنوئی میں آنا، مندرق کا کھڑا کھولنا اور کھال
 اٹھا دیا، ڈھکنا کھال تاکہ کھال بڑا دشت سزا کا کھال اٹھا دیا
 کنوئی میں پہل گیا، لوگوں نے اپنے ناک کھینچنے لگے، انجمن ڈھکنا پر
 دوزخ لکھ کر کھٹے ہوئے مندرق پر کھلا، پانچ کی دھم دھم مٹی میں
 اس نے ایک غریب کی منٹ کر لیا، مندرق مٹی کی انجمن میں
 سے جبراً اٹھا، انجمن کی کھال مٹی کے دوزخ میں نے اپنے گھر لے گئے۔
 پہلے ہوئے کھٹے تھے، انجمن نے بہت کھالیں اٹھا، ان پر
 آدی تھیں، مٹی کی مٹی ہوئی تھی، پھر اس نے دوزخ میں انجمن
 اٹھا کر مٹی میں ان پر بھی اٹھا کر مٹی کی مٹی اٹھا، پولیس انجمن
 نے بہت انجمن سے دوزخ کی کھال کنوئی سے باہر
 نکالنے کا انتظام کیا، تاکہ اس میں رکھی ہوئی پراسرار چیزوں
 کو دیکھ کر ان میں سے مگر ان پر مزید تحقیق کی جا سکے، چنانچہ
 راتوں رات قریبی کیسب سے کر کے منگوائی گئی، میں نے مندرق
 کو اس کے قدیم مکان سے اٹھا کر پولیس کے مسلح دھک پر لا دیا۔

پولیس نے اپنی رپورٹ مٹی کی مرکزی حکومت کو پیش کر دی
 اس رپورٹ کی روشنی میں حکومت نے ملکر آنا مقدمہ کو ریت کی کر
 ہوئے کنوئی کو موز مکر دیا، تاکہ آنا مقدمہ کے قناخوں کا کھڑ
 عبد اللہ کو اس نے تحقیق پر چیک کر رہا دیا، تاکہ عبد اللہ
 کی اعانت کے لیے ان کا اسٹنٹ مسلم، بیٹی فوری جو آنا مقدمہ
 کی جائیداد میں ایک باورچی بھی جاتا ہے، وادرات پر پکڑ گئے، ڈاکٹر
 عبد اللہ اور فوری دن بہرہ مندرق سے نکلنے والی انجمنوں اور
 چھڑے کے مٹھوں پر مٹی ہوئی تھوہر شانت کرنے کے لیے مٹی
 مٹی کا بون کا مٹھارہ کرتے اور ملے کھال کے کام کی لگائی کرتا،
 جو اب ایک وسیع تہہ میں ہو رہی تھی۔

ایک دزد و دہر کے وقت ڈاکٹر عبد اللہ کنوئی سے بچنے
 والے مٹی کے ایک پراسرار ایجنٹ پر تحقیق کر رہے تھے کہ انجمن کی
 جتنی مٹی اور ایک مزدور ایک پراسرار ایجنٹ تھا۔
 "پانچ... اور... کھال کے دوزخ... میں
 قبر پر آکر... ہوئی ہے۔" مزدور نے رنگ لک کر ہیام
 دیا اور آٹھ پاؤں ٹوٹ گیا۔

ڈاکٹر عبد اللہ مزدور کے کھال سے مٹی کی مٹی پڑے تھوہر
 سے لکھنے والے سے باہر نکلتے اور اپنے بے رنگ جھڑے کنوئی
 کی طرف دھاڑ دھڑکے، فوری میں اپنے آپ کے کھٹے دھڑکی۔
 کنوئی پر پانچ کر ڈاکٹر عبد اللہ نے دیکھا، مزدور دل میں
 سرسبز مٹی ہوئی ہے، تاکہ اس میں ایک طرف مٹی کی مٹی اور فوری
 انداز میں آپس میں پوچھ گچھ کیا کر رہے ہیں، ڈاکٹر نے مٹی دیکر
 ان کی بہت بڑھائی اور ان میں دلدلہ کام پر لگایا۔

چنڈی مٹی بھلا ایک مزدور سرسبز مٹی کی کھال اس کے
 ہاتھ سے چھوٹ کر دوزخ باورچی خوف کے ساتھ وہ بڑی طرح
 کا پتہ رہا تھا، اس نے انجمن کے ہوتے لیے میں بتایا، قبر میں سے
 کسی جانور کے غرائی کی آواز آ رہی ہے، ڈاکٹر نے کھال کے لیے کام
 بند کر دیا، خود کنوئی میں آکر اور قبر سے کان لگا کر مٹی کی مٹی
 کسی جانور کے غرائی کی آواز سنائی دی، اس نے چند دوزخ میں
 سے بھی ایسا ہی کرنے کو کہا، مگر ان میں بھی کچھ سنائی دیا، وہ چنانچہ
 مستحق طور پر بڑھ کر مٹی کے دوزخ کو مٹی، راہ پر چلا۔
 قبر کے اندر کوئی جانور نہیں ہے۔

مسئلہ پانچ گھنٹے کی دھڑک کے بعد مل کر قبر پر آکر کر لی
 گئی یہ قدیم اور پراسرار پند مٹی، لمبی اور اسیان ف مٹی
 مٹی سر ہانے مٹی ناہر دوزخ کا تھوہر کا تھوہر مٹی جو موز بڑا نہ کے
 سبب سیاہ پڑ چکا تھا، پھری قوت، ریت مٹی دھڑک سے مٹی
 مٹی، البتہ مٹی جیسے شگاف پر سے ہوتے تھے جن سے قبر کے
 اندر کی مٹی کی صاف نظر آ رہی تھی۔

تو کہ جس سے بغیر کھانا کا کام ہماری راہی سے کو قبر کی برادگی کے ساتھ ہی کسی عمارت کے مکان نظر آنے لگے تھے۔ اس مرد کی مسلسل کھانا کے لئے نہ تو شکر کی ایک دیوار بکھری تھی۔ یہ ایک بڑی ہی عمارت کے آگے دکھائی دینے لگے۔ وہاں کھانا تھا۔ کچھ اور کھانا بھی، تو کوئی دیوار بکھری عمارت نظر عام پکائی گئی۔ کھانا کا سلسلہ ہماری راہ اب مختلف قسم کا سامان بلکہ جوئے لگا۔ رنگ آلود ہوس کے سر پہ شہتیرہ لکناں مختلف برتن، پتھر کے مجسمے اور اوزاروں کی شبیہیں، رنڈر رنڈر ایک مٹا اور سارے کا کھانا دریافت ہو گیا۔ اُنہی کے آگے دروازے، پستہ فرش، مربع میزیں، صندوق، پتھر اور پتھر جو تہ سے عمارت کی تہیم عمارت کی شانہ ہی کر رہے تھے۔

اس سسٹم میں اور فوری خوش تھے کہ انہوں نے اس عمارت کی دریافت میں جو سارے کو علم آگاہ و قریب کی بڑی خدمت کی ہے، لیکن ڈاکٹر عبد اللہ کی گھر سے خیال میں ہم تھے انہوں نے عمارت کی ایک ایک چیز پر تحقیق کی، مگر تہ ذیل ساکاری عمارت کے لئے تعمیر کرانی کتبہ تھی، کوئی اور کہہ کر آدھہ قبر میں کون دفن ہے؟ ان تمام سوالات کا جواب حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ان شہزادوں سے جو ہے جوئے صندوق سے بلکہ والے چڑے کے گڑوں کی تحریر شہادت کی باقی ڈاکٹر اپنی تمام گوشہ نشینوں کے باہر و درون شہر میں ناکام رہا تھا۔ چنانچہ اسی نے جوئے پر لکھی ہوئی تحریر ایک مزدور کے گھینے تاہر کے ایک شہر و قریب شہر ساہو خان کو بجا دیا۔

اب تک کھانا کنویں کے ایک جانب ہو کر رہی تھی ڈاکٹر نے دوسری جانب سے بھی کوئی نہ کام دے دیا۔ ایک مرن کا ڈکھ ہے۔ کیا وہ بے کمال ہو گا، اور مزدور کھانا میں مصروف تھے، انہیں وہ طلبہ آکا زامیں پہنچے تھے۔ ڈاکٹر عبد اللہ اللہ عریضی کنویں کی طرف بڑھے، جہاں کہ کھانا، تو بدشت کی ایک لہر ان

کی لگ چھ میں دو گئی۔ دونوں مزدور کنویں کی تہ میں بڑی طرح اکھیل کو رہے تھے۔ ان کے دستان ایک ہیستہ کی لسانی کھڑی شیشائی آغا ز میں کچھ ہی تھی، مزدور کو پڑنے لگے ہی ہی بیچ لکھتے اور بے حال ہو کر زمین پر گر پڑتے۔ لگے ہی لگے کوئی بھی حالت انہیں دوبارہ کھڑا کر دیتی اور پھر پکار کا غوغا کل محل دوبارہ شروع ہو جاتا۔ ڈاکٹر عبد اللہ نے رستہ منکھوایا اور اس کی دوسرے دونوں مزدوروں کو باہر نکال لیا اور مزدور کنویں سے مل آئے، تو کھڑی ہی ایسی جو رسالت ہو کر گئی۔

عامی دیر کے بعد مزدوروں کے ہوش واصل ہو کر چلے، لیکن وہ اپنے اچھے کونے کی کوئی تحریر بیان نہ کر سکے اور کھڑا نہ لپٹے سسٹم میں کے ساتھ کنویں میں آ کر گئے۔ ڈاکٹر کے ہاتھ میں گولیوں سے بھر ا ہوا پتھر تھا اور اٹھی بڑی ہوشی انہوں نے پتھر اڑا دیا۔ اگر کوئی نہ دے گا تو اس کی ایک جگہ کرنے کی کوشش کی تو اس پر فائر کر دیں گے۔ جلیب کے پاس ایک تھیلا تھا، ڈاکٹر اور ملیم ڈرستے ڈرستے، پتھر تک پتھر تک کو قدم بڑھاتے ہوئے کھڑی کے پاس پہنچ گئے۔ پتھر اڑنے لگے ہاتھ آگے بڑھا کر بڑی تیزی سے کھڑی کو دو بچ لیا اور ملیم کے تھیلے میں ڈال دی۔ اب وہ واپس باہر آنے کے لیے نکلے۔ اچانک ڈاکٹر کا پاؤں ایک نرم جگہ میں دھنسا اور پھر ہی سختی کی چیز سے ٹکرا کر ٹک گیا۔ ڈاکٹر نے پھرتی سے اپنا دھنسا ہوا پاؤں نکالا اور لال کی دوسرے نرم زمین کو دیکھی، کسی عمارت دونوں نے پتھر اٹھا کر تہاں مزدور کا ملیم ہاتھ خون سے لہڑنے لگا۔ ڈاکٹر نے تسلی دی کہ اور کھڑے پاؤں اور ہر سیدہ انسانی اعضا جمع کرنے لگا۔ چند دنوں بعد بہت سی کھڑے پاؤں، مسخ شدہ انسانی اعضا اور جو سیدہ ڈھانچے تھیلے میں بند کر کے دونوں عمارت میں لوٹ آئے۔

رات کا کافی بیت چکی تھی، مگر ڈاکٹر عبد اللہ کے پیچھے میں وائٹین اسی ایک وقت تھی انہوں نے ایک بڑے سے سبز پتھر کنویں سے لائی ہوئی کھڑے پاؤں اور دوسرے انسانی اعضا ترتیب

طرح طرح شکل اختیار کرتا جا لیا، پھر اس نے دیکھا ایک دبیرہ فوجان اس کے سامنے کھڑا تھا، پکارا انھیں اسفند بیا چوڑا بھی لپی انگلیاں، دراز گیسو، فزیر کی انھیں خون کے داسے پھٹی کی پٹی باندھ گئیں، اس نے جتانے کی کوشش کی مگر اور جیسے اس کے حلق میں ایک گڑبگڑ گئی، اس کے اھلب کا سناؤ شدید تر ہو گیا، مٹا اس کے جسم نے پھر پھری لی اسے یوں لگا جیسے کوئی ناپیدہ قوت اسے گویا بی پر غور کر رہی ہے۔

اس نے اس شہرین دیکھے، فزیر پر اسرار فوجان سے خطاب ہوئی۔ فوجان بڑے طلاق سے قدم اٹھاتا آگے بڑھا اور فزیر کے بستر کے قریب پہنچ کر دونوں بازو پھیلا دیے، اس کی انگلیوں میں سرخ سرخ ڈوسے کچے کیل نظر آتا تھا، ایک لپک کر فزیر کا کلا دھو بیٹھا۔

شہرین دیکھنے لگا۔... شہرین دیکھ... یہ بڑی ہی عمارت ہے، فزیر نے فوجان سے دور سرکے کی کوشش کرتے اور کھلاتے ہوئے کہا۔ فوجان کا رد عمل خاما صلاحت آمیز ہو گیا، اس نے وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ تلایا اور دھڑکتی ہوئی گڑبگڑ کو گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

خیمے کے قریب کھڑے ماحول میں گڑبگڑنے کی آواز سے ڈاکٹر عبد اللہ کی آنکھ کھل گئی۔

کون ہے؟ ڈاکٹر کی پاٹ اور آواز گونجی۔ فزیر نے بھی پھری آنکھوں سے اپنے باپ کی طرف دیکھا، پھر اس کی نگاہیں دوبارہ گڑبگڑ پر پڑ گئیں، اس کے خون کے اس کا رنگ پیلا زرد ہو گیا، گڑبگڑ پر فوجان کے بھانے ایک مونا تازہ خون کا پلا میٹھا تھا اور اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ فزیر نے پھر جلدی اور اندھے شہر کے گڑبگڑ ہو گئی۔

ڈاکٹر عبد اللہ لپک کر اپنی بیٹی کی طرف بڑھے، اس کا جسم

سے لگا جیسے تھے اور خود کو کسی پڑھنے مختلف مادہ کی بھی تفریق میں مشغول تھے۔ قریب ہی ان کی بیٹی فزیر اپنے بستر پر گڑبگڑ سو رہی تھی۔ وائٹین کی دم گڑبگڑ میں ڈاکٹر عبد اللہ کو بھی کسی صورت کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسرے مقام پر لے گئے، خیمے کے کنویں پر ہونک اس کے سامنے تیرنے لگے، مگر ڈاکٹر ان تو بہت سے بے نیازانہ کام میں مصروف تھے کچھ دیر بعد انہوں نے پھر شہر اور لال کو کڑی ترتیب دی، پھر ان کا ایک خیمہ کتب میں مندرج عمارت سے موازہ کیا، اس طرح ڈاکٹر ایک خیمہ پتھر پر پہنچ گئے، سامنے سبز رنگ کے ہرے مختلف انسانی اعضا صرف فوجان وائٹین کے تھے قبرستان کی سرحد کا اور لال کی کون میں؟ ڈاکٹر اس خیمے کو کھانے کی ایک گمشدہ تہ سے لپٹے، مگر کسی خیمے پر پہنچنے کے بعد وہی شہادت سے لپٹے اور بستر پر ہاک دراز ہو گئے، پھر ہی انہیں فزیر گئی۔

خیمے کی خفا میں کچھ رنگ پر اسرار فزیر اور فونک ستارہ لپک ہوا پھر پھر سے پتھر اٹھا کر پٹائی دینے لگا۔ دور جنگی ماحول کے خیمے چوتھے اور دھارنے کی بے لگم ڈروائی پتھر پٹنے لگیں، شہر و شہر کی رضا یا یہ دیر تک قائم نہ رہی چند دنوں میں دوبارہ پہلا سا کھوت چھا لیا ڈاکٹر عبد اللہ کے خیمے میں سہی ہوئی فزیر کو یوں لگا جیسے کوئی اس کے پاؤں کے محسوس ہوا ہے، اس نے جگہ جگہ آنکھیں کھول دیں، سامنے اس کا باپ فزیر نے سامنے خیمے کا دھڑا ڈوروں کے ساتھ اچھا طرح بندھا ہوا تھا خیمے میں ان دو باپ بیٹی کے علاوہ کوئی ذی روح موجود نہ تھا۔ فزیر نے ایک لپٹے کے لیے فون طاری پانگڑوں سے جلادی اپنے آپ پر کاپیاں لٹا کر اس نے خواب دیکھا ہے، اس نے دل ہی دل میں کہا کہ پھر بھی گڑبگڑ سوچ پتھر ہو گئی، اسی عالم میں اس کی نظریں پتھر کی ہوئی کھڑے پاؤں پر پڑی، اسی پتھر... اس کی نظروں کے سامنے سبز سے لپٹنے لگے خیمے کی دیوار میں سے ایک سا بھر ہوا پتھر اٹھا رہا جو

بڑی طرح لڑ رہا تھا، ہونٹ سمیٹ کے ساتھ ایک دوسرے سے
 بچنے ہوئے تھے اور ملا جملے سے یہ شرابور تھا، پھر وہ دوا
 کی کھون پینے اور دن پوری طرح بند تھا اور دوا پیاں لگتی تھیں
 تھی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر دوبارہ فزیر کے پاس پہنچے اور اسے
 ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگے۔ راستے میں قریبی جینے
 کے مزدور پہنچ گئے، انہوں نے فزیر کے جینے اور کسی خوفناک
 پتے کے فزیر کے آڑ میں اپنے کالوں سے نئی تھیں۔ ڈاکٹر
 نے مزدوروں کی ہر ایک راہیں پیچ دیا، تھوڑی سی کوئی بات
 نہیں، فزیر سوئے میں لکڑی اور جاتی ہے، مزدور واپس تو چلے
 گئے، مگر کثرت پھر گونا گونا اندیش کے کٹنے پٹنے رہے۔
 اُن کا خیال تھا جلد ہی کوئی بہت بڑی مصیبت آئے والی ہے۔
 وہ نوکری چھوڑ کر بھاگ جاتے، مگر پولیس کے خوف نے
 اُن کے پاؤں ہانڈہ رکھے تھے۔

پندرہویں روز بھی گدائی کا کام منہول کے مطابق جاری رہا۔
 غروب آفتاب سے ذرا پہلے اس کا ہر بادل چھا گئے، پھر کئی گھنٹے
 لگی اور سلاخا دھار ہاتھ ہونے لگی، مزدور اپنے جینوں میں دیک
 گئے ڈاکٹر عبد اللہ اور فزیر کو ہر ایک مٹا کر کے بند کر گئے۔
 آدھی رات کے قریب ایک جاگ فزیر کی آنکھ کھل گئی، اُس نے
 دیکھا وہی پرانے روزی اُس کے سامنے کوسری پر بیٹھا ہے اور
 اس کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ چلی ہوئی ہے۔ فزیر کے
 اعصاب متزلزل ہو گئے اور وہ حواس ہانت ہو گئی، آنکھیں پٹی
 کی پٹیوں میں، اُس نے چرخ ہانڈے کی کوشش کی، مگر کھسکی رہا
 گئی۔ فزیر نے اپنے ایک ہاتھ اُسے ٹھٹھا، ساتھ ہی اس کے
 لب پہنے لگے وہ کچھ کہہ رہا تھا، مگر فزیر کو کوئی افہام نہ تھا۔
 پھر اُس نے لگتی سے اُسے ہونے فزیر کو اپنے پیچھے آنے کا
 نثار کیا، فزیر میں نہ جانے کہاں سے قوت آگئی، وہ اُنظر
 اسی ہوئی اب وہ دونوں ایک دوسرے کے آگے پیچھے جا

رہے تھے، فزیر نے دیکھا انہوں نے جو تھے کوشش کی کثرت بڑھ
 رہا ہے، وہ جو تھے کوشش کے کمر اسے واقعہ تھی، رات کے
 وقت ایک شلوک سامنے کے ساتھ وہاں جانا اپنے آپ کو روت
 کے حوالے کرنے کے متعلق تھا، مگر اُس کے قدم خود بخود اُٹھتے
 چلے جاتے تھے، جو تھے کوشش کے کٹنے پٹنے کو فزیر کو لگا گیا۔
 فزیر بھی ایک طرف جا کھڑی ہوئی، فزیر نے کوشش کے لڑ
 جانا، پھر نہایت بے پرواہی سے اور بے فکر انداز میں فزیر لگا گیا۔
 ساتھ ہی کوشش کے اندر سے کوشش میں لگا رہا تھا، پھر
 کیا دیکھتی تھی کھوپڑیاں، پھیلتی ہوئی اور آہی آہی فزیر اس
 منظر کی تاب نہ لاسکی، اُس نے بھاگنے کی کوشش کی، مگر وہ
 محسوس ہوا انہوں نے اُس کا رستہ روک دیا ہے اور اُس کے
 قدم زمین میں گڑ گڑ رہے گئے ہیں، ہاتھ میں کھوپڑیاں کوشش سے
 باہر آگئیں اور وہ ان دونوں کے گرد گرد حلقہ بنے، دویم
 چارسی تھیں، ان کا حلقہ طرہ بہ طرہ تنگ ہوتا تھا، اُس نے پھر
 بھاگنے کی کوشش کی، مگر وہ جی میں ایک کھوپڑی سے ٹکرا کر
 گر پڑی، وہ دوبارہ کھڑکھٹکا بھاگنا چاہتی تھی، اُس نے اپنی منہلی کا
 احساس ہوا، وہ فزیر پر موجود تھی، جیسے میں قریب کی چٹکی
 سی روشنی پہیلی ہوئی تھی، اُس کے والد ڈاکٹر عبد اللہ قریب ہی
 منہ کی فزیر سو رہے تھے، پر فزیر کی دھیاں بدستور کھسکی
 ہوئی تھیں۔

اس روز کے بعد فزیر کی محنت بڑھنے لگی، اُس کا جسم
 ہر وقت بڑھتا رہتا تھا، کٹا کٹا خیال تھا فزیر کچھ دواؤں
 کے لیے اپنی خال کے ہاتھ ہر جی جائے۔ اگلے روز فزیر تھا
 اور ڈاکٹر کو کسی غرضی کام سے دلاستیف جانا تھا، چنانچہ طے
 پایا وہ اسے قور کی جی کو تاہم چھوڑ آئے گا۔
 ڈاکٹر کو گھپ سے روانہ ہوئے تھوڑی دیر ہی گزری تھی
 کہ پوسٹ میں آگیا، اُس نے ایک سرگرم اور جڑو فزیر کو اپنے
 کی پیشانی پر شرخ روشنائی سے لٹکا ڈالی، دیکھا ہوا تھا فزیر نے

انداز ڈاکٹر کے ہاتھ پر کھڑکھڑا ڈاکٹر شام گئے تک نہ آئے تو اس
 نے رات کا کھانا کھایا اور دوا کی پیروی کی رات گیارہ بجے
 کے قریب ڈاکٹر واپس آئے، وہ اتنے تھکے ہوئے تھے کہ کھانا
 کھا لے اور فزیر کو دیکھ کر فزیر پر روت پڑ گئے۔
 جیسے میں سکوت میں رہا تھا، ڈاکٹر عبد اللہ اور فزیر گہری
 فزیر سو رہے تھے، ایک ایک قریب کے جھلک سے فزیر واپس کے کچھ
 کی آواز میں آئے تھیں، یہ آواز میں طوہ طوہ جیسے کے قریب آ رہی
 تھیں، پھر کھانا کھانا کھانا کے کھانا کے کھانا کے کھانا کے
 رہے ہیں، پھر کھانا کھانا کھانا کے کھانا کے کھانا کے کھانا کے
 زور میں پر رہی، کھانا کھانا کھانا کے کھانا کے کھانا کے کھانا کے
 جس سے ہمارے طرف ایک قابل پر پشت اندھیرا پھیل گیا۔
 فزیر کا وہ عمارت بڑھ گیا تھا، جس کی شدت سے اُس کے
 جسم سے آگ لگ رہی تھی، اُسے فزیر محسوس ہوا جیسے جیسے میں
 بڑا کا اور وہ جو کھانا کھانا کھانا کے کھانا کے کھانا کے کھانا کے
 کو کھانا کھانا کھانا کے کھانا کے کھانا کے کھانا کے کھانا کے
 "ہمت خیرا، انہوں ہی مصیبت تھی، یہ سب کے چہرے پر شکوہ فزیر
 مسکراہٹ میں کھلی تھی، انہوں نے کھانا کھانا کھانا کے کھانا کے کھانا کے
 ہو گئیں، اُس نے دقتیں بے قدم اُٹھائے اور فزیر کو لگے
 سے دقتیں بے قدم اُٹھائے اور فزیر کو لگے
 ایک گھر سے ایک ایک خانہ میں آتا رہا ہے، فزیر کو گھپ میں
 اُسے کئی جہتے ہو چکے تھے، مگر اُس نے یہ غرضی ہر تہہ دیکھا
 تھا، سوئی فزیر کے اندر ایک کونے میں پچ کر لگا گیا اور اُسے
 فزیر پر پڑا، پھر اُس نے دیکھا وہ اس شیطانی کی گوت میں ہے۔
 اس کے اعصاب جیسے پڑ گئے اور فزیر کی آواز میں پڑ کر رہ گیا، تاہم
 اس نے جلد ہی اپنے پیچ پر قابو پایا، پھر ہی قوت سے اُس کی
 گوت سے کھنکھن کوشش کی اور پھر جیسے اُس نے اُسے دیکھ کر
 گر لیا، وہ اس کشش سے بڑی طرح اپنی رہی تھی، تاہم زبرد
 سے کئی آواز سے رو چک گئی، اُس نے دیکھا وہ اپنے ہاتھ

پر مٹی تھی، جیسے کا پردہ بدستور ڈھیلے سے بندھا ہوا تھا،
 اللہ اُس کے باپ کے ساتھ کوئی نکتہ اُسے یقین ہو گیا کہ اس
 نے کوئی خواب دیکھا تھا، اُس کا انگ انگ دیکھا تھا، اُس کا
 اور تیز ہو گیا تھا، پھر ایک اس پر غور و فکر کا عالم جاری ہو گیا، وہ
 بستر سے اٹھی، کھانے کے پرے کی کھوپڑیاں کھولیں اور ایک لکڑی
 اٹھا کر باہر نکل گئی۔
 پھر رات کو ڈاکٹر عبد اللہ کی آنکھ کھل گئی، انہوں نے محسوس
 کیا، اُن کی کمر کے نیچے کوئی سختی تھی، پھر دیکھ کر ہوئی ہے بستر کو
 ٹھٹھا، تو ایک بڑا سا نڈر تھا، رات کو دلاستیف سے ڈاکٹر لٹے
 تھکے ہوئے آئے تھے کہ اس انداز میں ہی پڑا کر گئے، جلدی
 سے لائیں روشن کی، اُس نے انداز کو دیکھا، لٹا تاہم سے تعلیم
 قریب کے کھانا کھانا کھانا کے کھانا کے کھانا کے کھانا کے
 جاگ لگا کھانا کھانا کھانا کے کھانا کے کھانا کے کھانا کے
 وہ کھانے ہی تھے جو شروین سے کھانے ہوئے مزدور سے بڑا
 ہوئے تھے، فزیر نے چہرے پر کھسکی ہوئی غم پرانہ لٹی لٹی اور
 اپنی رپورٹ میں بھی اُس نے لکھا تھا:
 "ہونے کوشش کی گرائی میں موجود قدامت طوہرہ کا
 عمل ہے یہ شخص آج کے کئی دھیاں پہلے اس میں رہتا تھا
 اس کے پاس رات کے بجا رہا ہوئے تھے، رات کی کثرت نے
 اُسے پیش و پشت میں ڈال دیا، اس کی راتیں فزیر کو قوت کے
 ساتھ گزرتیں، رات کے ساتھ ساتھ اس کی ہوساں میں اندھیرا
 گیا، اُس کے ہاتھ کی فزیر محنت کی کثرت محسوس نہ رہی۔
 اس کے کاندھے شکاری کوشش کی طرح مٹا لٹے رہتے اور
 فزیر محنت کی طرف اشارہ کرتا، اُسے دیکھ کر کھانے کے ہاتھ
 ایک مٹا دھیب شکاری اُس کی ہوساں کا نشانہ بننا شروع ہوتے
 ہی رات کے کھانا کھانا کھانا کے کھانا کے کھانا کے کھانا کے
 جوں جوں مٹی شیار بڑی فزیر کو کھانا کھانا کھانا کے کھانا کے
 فزیر رات میں شیار کا کھانا کھانا کھانا کے کھانا کے کھانا کے



ایک عجیب و غریب قتل
پراسرار و شگاف

پراسرار قتل

عجیب کہانی

”آپ کے لیے نہایت ضروری ہے کہ اپنے آپ کو کم اور
خفیہ کے اثرات سے محفوظ رکھیں، ڈاکٹر مین نے اپنے قصوں
انداز میں کہا۔“

مسز مارٹر کے بشر سے معلوم ہوتا تھا، اس قسم کی باتوں
سے اطمینان کے بجائے اس کے شک و شبہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

”آپ کا دل بے شک کمزور ہے، گریٹھن واکر بول
کہ پریشان ہونے کی چند ضرورت نہیں، ڈاکٹر نے بات بدل
رکھی، ”بہر حال آپ اپنے مکان میں لفت ضرور لگوائیں۔ کیوں؟
آپ کا کیا خیال ہے؟“

ڈاکٹر مین غریبوں کے بجائے امیروں کا علاج کرنا پسند
کرتا تھا، شاید اس لیے کہ امیر لوگ اس کی ولایت پہلے پہل
عمل کرتے۔

”ہاں تو لفت ضروری ہے، ڈاکٹر نے اپنا سامان پیٹنے
ہوئے کہا، ”اس طرح آپ صحت و تندرستی سے بچ جائیں گی۔“

تھوڑی سی روزش پڑی نہیں لیکن یہ میاں پر خفیہ سے انتہا
کر رہا اور سب سے اہم کہ اپنے دل و دماغ پر کسی قسم کا بوجھ
ڈالیں اس ہی طریقہ ہے، اپنی صحت کو زیادہ سے زیادہ محفوظ
رکھنے کا۔“

ڈاکٹر مسز مارٹر کے پیچھے کسی ایک طرف لے گیا اور کھٹے

نفل ڈالتے ہی ایک ٹوک سی آن کے سینے میں اٹھی اور پھر جیسے کسی
نے اُن کے دل کو اپنے پتھل میں دبوچ لیا، وہ بے ہوش ہو کر
اگرے اور لگے ہی لے اُن کی جان بچا ہو گئی۔

پولیس کی جی کی جیب کے قریب پہلے ہی سے ہاتھ تھم
رہے تھے ہی پولیس کے سپاہی ڈاکٹر عبد اللہ کے خیمے پر پہنچ گئے۔
فوزی کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے مجبوری کی پولیس خستہ
ڈاکٹر کے خیمے کا جائزہ لیا، مگر تحریر رضوان کی پورٹ پر مدد کر

اسسٹنٹ حلیم نے کہا آثار قدیمہ کی کتاب میں ایک نئے باب
کا اضافہ ہوا ہے۔ فوزی کے کاغذات میں اس کے ہاتھ کی
ایک دائریں مل گئی ہیں جس پر کچھ دقتیں غنوں سے جو کچھ اس
کے ساتھ پیش آ رہا تھا، اس کی اخصیصت تاریخ و تاریخ درج نہیں
ایک ہیوے اور خوفناک پتے کا ذکر تقریباً ہر تاریخ میں تھا۔
ایک دن پہلے کی تاریخ میں کھوپڑیوں کے قس کا ذکر بھی تھا۔
سب لوگ اس خیمے پر پہنچے کہ فوزی وہاں کاشکار ہو گئی۔

کھڑکی کا کام کئی روز تک بند رہا، جیب کی فضا سگوار
ہونے کے ساتھ ساتھ دہشت انگ بھی مچی، آخر حکومت اور
پولیس کے دباؤ سے مزدور دن نے ڈرتے ڈرتے پھر کام شروع
کیا، اب علمی ماری تو خراس منقش قبر پر مگر کوئی بھی کاکر
رضوان نے بھی کیا تھا، اس نے مزدوروں سے کہا اس قبر کو
گرا دو، مگر کسی کو حوصلہ نہ ہوا، انہیں متذنب دیکھ کر وہ خود
آگے بڑھا، ایک مزدور سے لڑائی اور پھر پتھر کے ٹکڑے پھینک کر

پرتاؤڑ خرمیں لگنے لگا، جلد ہی پتھر ٹوٹ کر انکھ ہو گئے
اور قبر ٹھٹھ گئی، حلیم نے ایک نظر اندر ڈالی، تو ٹھٹھ کر رہ گیا
اندر ایک خوفناک پلاٹنوم پلا تھا، شاید قبر کھودتے وقت ایک

غریب اس پر بھی جگ لگئی تھی مگر وہ کہاں سے آیا تھا؟ ایک
فوجیوں کا سپاہی اور کھوپڑیوں کا قصہ تو وہی دماغ کی اختراع
ہو سکتا ہے، مگر یہ تو... اور پھر حلیم سر پہنے گا کیس

وہ بھی تو دم کا شکار نہیں ہو رہا؟

جیت انسان غار ندے سے چلنے کی بہت کوشش کی، مگر
نا کام رہی، خوف و رت بھر دھن دھن دھن، صبح اٹھ کر صبح بولی
اُسے قتل کر دیا، لوگوں میں اپنی رگوں کے گم ہو جانے پر خوف و
ہراس تو پہلے ہی پھیل چکا تھا، حاکم شہر کی بیٹی گم ہوئی تو کوہرام
بچ گیا، پولیس حرکت میں آئی، واقعات کی گزیاں سننے لگیں،
جلد ہی سردار خوف کا بھانڈا پھوٹ گیا، اس پر مقررہ ملازم الام
صبح نہایت ہوا، عدالت نے فیصلہ سنایا، خوف سردار کو زندہ دنگ
کر دیا جائے فیصلہ سننے کے بعد خوف نے عدالت سے استعفا کی۔

مجھے اپنی عالی شان حویلی میں دفن کیا جائے، عدالت نے
اُس کی یہ درخواست منظور کر لی، جس کا خوف کو جیتے جاگتے
ایک خاص صورت اور منقش قبر میں دفن ہو گیا، اس زمانے کی
رحم کے مطابق اُس کی دولت کا دوسرا حصہ مشرفوں کی موت
میں ایک ہوش سے صندوق میں بھر کر ان کے اوپر چڑے کے
کاغذات رکھ دیے گئے، جن پر خوف کے سوا کچھ نہ رہا۔

ڈاکٹر نے پورٹ پر کھڑا ایک طرف کھڑی دیالٹن بچائے
سے پہلے اس نے خیمے کا جائزہ لیا، اس کی نظر فوزی کے بستر پر پڑی

تو وہاں خطا ہو گئی، بستر پر مٹی پڑا تھا، خیمے کے پردے کی
طرف دیکھا، کھلا تھا، فوزی وہ جیسے سوئے باہر نکلے، مگر
باہر خوفناک ستارے کے سوا کچھ نہ تھا، ڈاکٹر نے پھر جرح کر

آؤڑی دی، فوزی، مگر ان کی ہر نگاہ رشتے میں
ڈوب کر رہ گئی، کہیں سے کوئی جواب نہ ملا، البتہ جیب میں ٹپ
چلی گئی، لوگ جگمگ بھاگ ڈاکٹر کے خیمے پر پہنچے اور خوف و رت کی
تلاش میں چندوں طرف پھیل گئے، صبح طلوع آفتاب کے وقت

کیہ لوگوں نے دیکھا، فوزی کی لاش ایک درخت سے چلی ہوئی
تھی، اس کے اپنے دپے کا پھندا اُس کے گلے میں تھا، ایک
گرمی ایک طرف گری پڑی تھی، فوزی کا چہرہ کالا سیاہ اور سخت

ڈراؤن ہو گیا تھا، جیسے اس نے کرباگ اونیٹ سے جان دی
ہو، ڈاکٹر عبد اللہ کے خیمے پر لاش لٹی گئی، تو اپنی اگلی قیچی پر

لگا، اگر آپ کی آنٹی کی صحت بہت خراب ہے اور دل کمزور
ہو چکا ہے، لیکن بہر حال وہاں بات پر عمل کر کے خیمے سے
تک زندہ رہ سکتی ہیں، انہیں نہ سکون زندگی گوارا دی جاوے۔

ہر وقت ضرورت رہتا جاوے اور زیادہ سوچ بچار نہ کریں،
زیادہ سے زیادہ خوش رہیں تاکہ خیالات بٹھ رہیں... آخر

میں ایک بات یاد ہے، کوئی معمولی سادہ مریض ہانا یہاں ہو سکتا ہے،
پارس بہت ہی ٹھیک ہونے والی کا فوجان تھا، خاندانے

لے عقل و صحت کی سہ پناہ تو تھیں، مگر وہی خیمے ڈاکٹر کے اٹار سے
اس کے چہرے پر پریشانی کی لہر چھائی، اُنڈ آئیں۔

اسی شام پارس نے گھر میں ریڈیو سیٹ گولانے کی تجربہ
دیش کی تاکہ اس کی لادول بھاگے، مسز مارٹر نے غافلت کی وہ
پہلے ہی غور و خوض کر لفت پر خائے افراہات اٹھیں مگر ایسی

پارس بھند رہا۔

”مجھے بے زمانے کی چیزیں ہل پھرنیں۔ مسز بارڈ نے کہا۔ ”میں سمجھتی ہوں کہ میرے دل و دماغ کا انداز ہونا انسانی، آپ کا خیال غلط ہے۔ ریڈیو دل و دماغ پر کوئی اثر نہیں ڈالتا، بلکہ اس کی موجودگی آپ کے لیے قہر میں لاسان مریا کرتی ہے۔“ ہارلس نے جواب دیا۔

مسز بارڈ کو بالآخر غنا مند ہونا پڑا اور فریٹ کے ساتھ ہی ساتھ ایک ریڈیو سیٹ بھی گھر میں آگیا۔ ہارلس نے انہی کو ریڈیو کے تمام روزانہ طریقہ سمجھا دیے۔ وہ بے حد خوش تھی کہ سعادت مند جیسا اس کا بے حد خیال رکھتا ہے، اچانک وہ بھی ہارلس سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ قبل ازیں مسز بارڈ نے اپنی ایک بیٹی میری کو کوپتے پاس رکھا، وہ لیسے وارث بنا تھا۔ سچی لیکن میری نے اپنے آپ کو اس کا الٹی ثابت نہ کیا۔ وہ اپنی آنٹی کو خوش نہ کر سکی۔ بیٹی سے محبت کرنے میں وہ ہمیشہ ناکام رہی۔ مسز بارڈ اپنا زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتی۔ بعد ازاں اس نے ایک ایسے نوجوان سے شادی کر لی جس کو مسز بارڈ تائب نہ کرتی تھی۔ تجربہ کہ مسز بارڈ نے اسے اس کے پاس بھیج دیا۔ بیٹیوں کو کمالیہ گھر کر اس نے اپنی توجہ بیٹیوں کی طرف مبذول کی۔ ہارلس کو وہ پہلے ہی سے پسند کرتی تھی۔ وہ بھی اس کا بے حد احترام کرتا۔ اس کو جسے دور کے ذکر سے بڑی دلچسپی سے سنتا اور ہمیشہ اس کی تمام پہچانے کی فکر میں رہتا۔

مسز بارڈ بھی اس کی سعادت مند بیٹیوں سے نہ سماں کی وجہ بددیاری طرح مطمئن ہو گئی، تو انہوں نے اپنے دل کو کیا کیفیت نامہ تیار کرنے کو کہا۔ خود غصہ و فتن میں وہ صحت نامہ تیار ہو گیا اور مسز بارڈ نے ہوشیار کرنے کے بعد اسے دیکھ کر حیرت میں آ گیا۔ وہ ریڈیو کی بدولت مسز بارڈ سے مدد غرض پہنچ گئی۔ وہ جب بھی تنہا ہوتی ریڈیو کے پاس آ بیٹھتی اور دنیا بھر کے پیش رفتی یہ خوشی بھی ہارلس کی ہر ہر بات تھی، اس لیے اس کے دل میں اپنے بیٹے کی محبت کو باک کر گئی۔

(۷)

گھر میں ریڈیو کے تقریباً تین ماہ گزرے تھے کہ ایک صیرت اچھیر واقعہ پیش آیا۔ ہارلس کسی رات پرانی میز پر بیٹھا۔ مسز بارڈ گھر سے آگئی تھی اور ریڈیو کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔ اس نے ٹھٹھ اندر زور پڑھتی تھی۔ اچانک مسز بارڈ کا ہر گرام بند ہو گیا اور گھر میں خاموشی کی سی خاموشی چھا گئی، پھر کسی مرد کی صحت اور شہتہ کا آواز سنا دیا۔

”میری کیا تم میری آواز سنی ہو؟“ میری ہارڈیول رہا ہوں۔۔۔۔۔ میں بہت جلد تھیں لیکن آواز ہوں تیار رہنا۔ تیار ہو گئی نا۔“

اس کے بعد مسز بارڈ کا ہر گرام پھر شروع ہو گیا۔ مسز بارڈ کو کسی صیرت کا شہتہ بہت ہی پسند آیا۔ اس کے دونوں ہاتھ کسی کے اندر لپکتے رہتے۔ کہہ کہہ کر اس کا دل کھینچ گیا۔ اس نے کوئی بھی ایک غلاب نہیں دیکھا۔ ریڈیو سے بارڈ کی آواز کیسے آ سکتی ہے؟ اس کو مزے تو حیرت کر گیا۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔ پھر خیال آیا کہ میرے کمر دروں کا خیمہ ہے یا ممکن ہے بڑھاپے کی اضمحالی کمزوری کی وجہ سے اسے ہوا ہو؟ تاہم اس نے غلاب و دھوا کا ذکر کسی سے نہ کیا۔ اور اسے بھلا دیا۔ چنانچہ اس نے قہری کہ ایسی نوعیت کا کوئی کوشش کے باوجود وہ اس سے گونہ برسا۔ اس کے دل میں غرض طرح کے دوسرے پیدا ہوتے رہے۔

”کہہ کہہ میری تمام کا درمیان واقعہ بھیجیں کہ ایک بے بی وہ کہے ہیں، بالکل سنا سنی ہو گی۔“ ہارلس نے کہا۔ اچانک خاموشی چھا گئی اور دوسرے آتی ہوئی آواز سنا دیا۔

”ہارڈیول سے غلاب ہے۔ میں تمہیں لینے کے لیے آ رہا ہوں۔“

”اگر کچھ بھی لینے کی غرض ہے تو دوسرے سے پہلے رات گزر جائے۔“

”اگر کچھ بھی لینے کی غرض ہے تو دوسرے سے پہلے رات گزر جائے۔“

اس نے اپنے بازو پر مٹی کی توشیحیں بڑا کر دے دیار ہے، جو کہ اس نے سنا ہے۔ ہارلس کے عالم میں سنا ہے اور اس کے گھر میں خوشیوں کے ساتھ بات چیت کی ہے۔ ہارلس نے غلابی لہروں کے ساتھ ہر گرام کا اس کے الفاظ اس کے ذہن میں گونجنے لگے۔ اس نے سوچا کہ ممکن ہے کوئی بیٹی ہوئی ہو کہ اس میں ایک بچہ گئی ہو اور بارڈ کی زور نے اس کے دلچسپ ہر سے رابطہ قائم کر کے ہونے والے واقعہ کی اطلاع دی ہو۔ مسز بارڈ نے کھینچ کر اپنی ہاتھ کی ٹانگہ سے مٹھ کر دیا۔

”الہ میری اللہ کی باتیں، ہاتھ والی اور اس میں سب سامان تیار ہے اس کی پالی لینے پاس رکھو۔“ مسز بارڈ نے ہونے سے کہا۔

”کوئی سامان تیار ہے؟“ ہارلس نے اس سے دریافت کیا۔

”میری تجھے یہ بتائیں گا۔“ مسز بارڈ نے کہا۔ ”کیا تمہیں یاد نہیں سامان خشک خشک کرنے میں تم نے میری مدد کی تھی؟“

”ہاں، ایسا خیال دل میں ڈالا ہے، آپ تو آپ کی محنت پہلے سے بہت اچھی ہے۔“ الہ نے دھتورے ہوئے کہا۔

”پھر تم کو ایک دیکھ دو۔“ مسز بارڈ نے غلابی انداز میں کہنے لگی۔ میری کو ہر بات ساٹھ سال سے اس پر ہو چکی ہے۔ تم سے وقت ہو کہ روٹی ہو، بھلا بڑھاپے کے بعد بھی اس پر جوانی کے دن کہنے ہیں؟ زندگی کا تو فقط ایک ہی ایام ہے، اور وہ ہے موت۔ اس منزل تک سب کو جانا ہے۔“

”تو جتنی روٹی ہوئی کہے سے جی گئی مسز بارڈ نے محنت سے اس کی طرف دیکھا۔“ بہت خدمت گزار اور غرض محنت سے اس نے میری بڑی خدمت کی ہے۔“ مسز بارڈ نے دل میں سوچا۔

”معلوم وصیت میں اس کے لیے میں نے کتنے پونڈ چھوڑے ہیں،“

”تو کیا ہے؟“ اس کو سوچنے نہ چاہی۔ یہ میرے پاس دوسرے سے کام کر رہا ہے۔“ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

”دوسرے دن مسز بارڈ نے اپنے دل کو خشک کیا کہ چھیننے؟“

”مجھے بے زمانے کی چیزیں ہل پھرنیں۔“ مسز بارڈ نے کہا۔ ”میں سمجھتی ہوں کہ میرے دل و دماغ کا انداز ہونا انسانی، آپ کا خیال غلط ہے۔ ریڈیو دل و دماغ پر کوئی اثر نہیں ڈالتا، بلکہ اس کی موجودگی آپ کے لیے قہر میں لاسان مریا کرتی ہے۔“ ہارلس نے جواب دیا۔

مسز بارڈ کو بالآخر غنا مند ہونا پڑا اور فریٹ کے ساتھ ہی ساتھ ایک ریڈیو سیٹ بھی گھر میں آگیا۔ ہارلس نے انہی کو ریڈیو کے تمام روزانہ طریقہ سمجھا دیے۔ وہ بے حد خوش تھی کہ سعادت مند جیسا اس کا بے حد خیال رکھتا ہے، اچانک وہ بھی ہارلس سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ قبل ازیں مسز بارڈ نے اپنی ایک بیٹی میری کو کوپتے پاس رکھا، وہ لیسے وارث بنا تھا۔ سچی لیکن میری نے اپنے آپ کو اس کا الٹی ثابت نہ کیا۔ وہ اپنی آنٹی کو خوش نہ کر سکی۔ بیٹی سے محبت کرنے میں وہ ہمیشہ ناکام رہی۔ مسز بارڈ اپنا زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتی۔ بعد ازاں اس نے ایک ایسے نوجوان سے شادی کر لی جس کو مسز بارڈ تائب نہ کرتی تھی۔ تجربہ کہ مسز بارڈ نے اسے اس کے پاس بھیج دیا۔ بیٹیوں کو کمالیہ گھر کر اس نے اپنی توجہ بیٹیوں کی طرف مبذول کی۔ ہارلس کو وہ پہلے ہی سے پسند کرتی تھی۔ وہ بھی اس کا بے حد احترام کرتا۔ اس کو جسے دور کے ذکر سے بڑی دلچسپی سے سنتا اور ہمیشہ اس کی تمام پہچانے کی فکر میں رہتا۔

مسز بارڈ بھی اس کی سعادت مند بیٹیوں سے نہ سماں کی وجہ بددیاری طرح مطمئن ہو گئی، تو انہوں نے اپنے دل کو کیا کیفیت نامہ تیار کرنے کو کہا۔ خود غصہ و فتن میں وہ صحت نامہ تیار ہو گیا اور مسز بارڈ نے ہوشیار کرنے کے بعد اسے دیکھ کر حیرت میں آ گیا۔ وہ ریڈیو کی بدولت مسز بارڈ سے مدد غرض پہنچ گئی۔ وہ جب بھی تنہا ہوتی ریڈیو کے پاس آ بیٹھتی اور دنیا بھر کے پیش رفتی یہ خوشی بھی ہارلس کی ہر ہر بات تھی، اس لیے اس کے دل میں اپنے بیٹے کی محبت کو باک کر گئی۔

”مجھے بے زمانے کی چیزیں ہل پھرنیں۔“ مسز بارڈ نے کہا۔ ”میں سمجھتی ہوں کہ میرے دل و دماغ کا انداز ہونا انسانی، آپ کا خیال غلط ہے۔ ریڈیو دل و دماغ پر کوئی اثر نہیں ڈالتا، بلکہ اس کی موجودگی آپ کے لیے قہر میں لاسان مریا کرتی ہے۔“ ہارلس نے جواب دیا۔

مسز بارڈ کو بالآخر غنا مند ہونا پڑا اور فریٹ کے ساتھ ہی ساتھ ایک ریڈیو سیٹ بھی گھر میں آگیا۔ ہارلس نے انہی کو ریڈیو کے تمام روزانہ طریقہ سمجھا دیے۔ وہ بے حد خوش تھی کہ سعادت مند جیسا اس کا بے حد خیال رکھتا ہے، اچانک وہ بھی ہارلس سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ قبل ازیں مسز بارڈ نے اپنی ایک بیٹی میری کو کوپتے پاس رکھا، وہ لیسے وارث بنا تھا۔ سچی لیکن میری نے اپنے آپ کو اس کا الٹی ثابت نہ کیا۔ وہ اپنی آنٹی کو خوش نہ کر سکی۔ بیٹی سے محبت کرنے میں وہ ہمیشہ ناکام رہی۔ مسز بارڈ اپنا زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتی۔ بعد ازاں اس نے ایک ایسے نوجوان سے شادی کر لی جس کو مسز بارڈ تائب نہ کرتی تھی۔ تجربہ کہ مسز بارڈ نے اسے اس کے پاس بھیج دیا۔ بیٹیوں کو کمالیہ گھر کر اس نے اپنی توجہ بیٹیوں کی طرف مبذول کی۔ ہارلس کو وہ پہلے ہی سے پسند کرتی تھی۔ وہ بھی اس کا بے حد احترام کرتا۔ اس کو جسے دور کے ذکر سے بڑی دلچسپی سے سنتا اور ہمیشہ اس کی تمام پہچانے کی فکر میں رہتا۔

مسز بارڈ بھی اس کی سعادت مند بیٹیوں سے نہ سماں کی وجہ بددیاری طرح مطمئن ہو گئی، تو انہوں نے اپنے دل کو کیا کیفیت نامہ تیار کرنے کو کہا۔ خود غصہ و فتن میں وہ صحت نامہ تیار ہو گیا اور مسز بارڈ نے ہوشیار کرنے کے بعد اسے دیکھ کر حیرت میں آ گیا۔ وہ ریڈیو کی بدولت مسز بارڈ سے مدد غرض پہنچ گئی۔ وہ جب بھی تنہا ہوتی ریڈیو کے پاس آ بیٹھتی اور دنیا بھر کے پیش رفتی یہ خوشی بھی ہارلس کی ہر ہر بات تھی، اس لیے اس کے دل میں اپنے بیٹے کی محبت کو باک کر گئی۔

بہت نگر کا دھوکا ہوا لیکن جی جان، پہلے تو مجھے ایسا دھوکا بھی نہیں ہوا۔۔۔

”تم نے انہیں کہنے والے کو جس میں دیکھا تھا؟ مسز بارڈ نے دوبارہ دریافت کیا۔

وہ بے حد حیران تھی، کوئلے والا کہہ اس کے شروع ہوا ڈرائیگ روم تھا، اس نے سوچا شاید اس کے تانہ کی طرح ابھی تک ڈرائیگ روم میں موجود ہے۔

شام کے وقت چارلس گھر میں تھا مسز بارڈ بے بیٹی کے عالم میں ریڈیو کے پاس بیٹھی پر اسرار آواز کا انتظار کر رہی تھی، اس کا خیال تھا قیسری بار بھی وی آواز آئی تو اس بات میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کی کہ اب وہ دنیا میں چند روز کی صحت ہے اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اور جب ریڈیو کو پھر پروگرام بند ہو گیا، تو اسے ذرا بھی حیرت نہ ہوئی۔ حضور ہی دیر کے بعد آکر شیشے میں بہت قدر سے آتی ہوئی نفوس آواز سنائی دیا:

”میری امیر اخیال ہے تم باطل تیار ہو۔۔۔۔۔ میں جن کو آؤں گا۔۔۔۔۔ رات کے نو بجے۔۔۔۔۔ ڈراما منت۔۔۔۔۔ تم کو کوئی تعلیم نہ ہوگی۔۔۔۔۔ میں تیار نہ ہوں؟ پھر فوراً ریڈیو پروگرام شروع ہو گیا مسز بارڈ گری پر ہے اس حرکت میں بی بی، اس کا رنگ سبز پڑ گیا تھا۔ بڑی مشکل سے اٹھی اور گھٹنے کی میز پر ہانپیں، اس نے کانپتے ہوئے باتوں سے لکھا:

”آج رات نہ اونیجے میں نے صحت طور پر اپنے عزم شوہر کی آواز سنی ہے اس نے مجھے بتایا کہ وہ جمعہ کی رات کو فوجی کیمپ چلنے آئے گا۔۔۔۔۔ اگر اس روز میں مرحاؤں، تو میری خواہش ہے کہ اس سب لوگوں سے کہہ دیا جائے تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ رسول کی دنیا سے رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔“

اس نے ایک بار تکرار کر خور سے پڑھا، اسے غصے میں بند کیا اور گھٹنی پر ہاتھ دبا کر بعد از وقت کرے میں دانی ہوئی۔ مسز بارڈ گری سے اٹھی، غصہ انزہ کو دیا اور ملی،

”البتہ، اگر جلد کی رات کو میں نہ رہاؤں، تو یہ غصہ ڈاکٹر میں مل کر خورے دیا، اس مسئلے میں مجھ سے کسی بحث کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے معاملات کو اپنی طرح سمجھتی ہوں۔۔۔۔۔ ہاں! میں نے اپنے حقیقت نامے میں تمہارے لیے پچاس پونے چھوٹے ہیں، میں چاہتی ہوں کہ تیس سو فیصد میں۔ اگر میں مرنے سے پہلے بنگ دھاکلی، تو چارلس میرے مرنے کے بعد غلام کرے گا۔“

دوسرے روز مسز بارڈ نے چارلس سے کہا: اگر اس کو کوئی حادثہ پیش آجائے، تو البتہ کہ مجھے پچاس پونے دے دیے جائیں۔“

”جی آپ کو ہم پروگیا ہے؟ چارلس نے سلی میٹے پر بے کہا: ”آپ بالکل صحت مند ہیں، میری دعا ہے کہ ہم آپ کی نویں سالگرہ منائیں؟“

مسز بارڈ نے چارلس کو کوئی جواب نہ دیا صرف ٹکرائی رہی، حضور ہی دیر کے بعد ہوئی، چارلس، مجھ کی شام کو تیار کیا پروگرام ہے۔“

میرے ایک دوست نے برج کھیلنے کی دعوت دی ہے اگر آپ ہاتھ ہیں کہ میں گھر پر ہوں، تو نہیں ہاؤں گا چارلس نے کہا۔

مسز بارڈ نے کہا: ”نہیں، نہیں میری یہ خواہش نہیں، میں اس رات بالکل تیار رہنا چاہتی ہوں؟“

جہ کی شام گھر پر خاموشی پائی ہوئی تھی مسز بارڈ رسول کے مطابق کسی پریشانی کے قریب تھی۔ وہ کوچ کی تیار کر چکی تھی، مگر بنگ بھی گئی اور پچاس پونے ڈاکٹر کو تانہ کو لے لیے۔۔۔۔۔ ادا نے اپنی تمام چیزیں طیلت کر کے رکھ دی تھیں۔

اس نے ایک بڑا سا لٹافہ کھولا اور اندر سے تھک گیا ہوا کاغذ نکالا، وہ وصیت نامہ تھا جو اس کے وکیل نے وصیت کے مطابق بھیجا تھا۔ ایک بار پھر لپٹنے کے بعد دوبارہ خود سے نظر ڈالی۔ یہ ایک مختصر سا رمل تھا جس میں اس نے پچاس پونے ڈاکٹر کو تانہ کے تمام ادویات پانچ سو پونے ڈاکے دو تھکے دو ہینول کے نام چھوڑے تھے اور باقی سب کچھ اپنے پیارے بیٹے چارلس کے نام لکھ دیا تھا اس نے اپنا سر گھٹی ہار لیا۔ وہ سوچ رہی تھی اس کی وصیت کے بعد چارلس بہت امیر آدمی بن جائے گا۔

اس نے گھر کی کی طوت دیکھا، فریج میں تین منٹ باقی تھے، وہ بالکل تیار تھی، اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، آخر فریج کھلے، اس نے سلی میٹے سے ریڈیو کاٹیں دے دیا، وہ آج پھر اس خصوصی آواز کی منتظر تھی، لیکن کوئی آواز سنائی نہ دی۔ ایک سرواڑا اس کی روم کی ڈی میں دوڑ گئی، حضور ہی دیر کے بعد پھر آواز آئی اور تھکوں کی چاب سنا دی، پھر کہنے والا چلنے چلے لگا، اس کی اور دروازہ آہستہ سے کھلا، خوف سے مسز بارڈ کا دم کانپنے لگا، اس کی آنکھیں مادھ کھلے دروازے پر جم گئیں۔ وہ صفحہ اس کا ماترہ دکھرایا اور وصیت نامہ سامنے جاتی ہوئی آغوش میں جاگرا، اس کے منہ سے ایک خوف ناک چیخ نکلی، کمرے کی دھڑکن میں ایک جالی پانی صورت کھڑی تھی۔ آخر بارڈ اس کو لینے کے لیے آئی گئی، اس کا دل ٹوٹنے لگا اور وہ گری سے گر پڑی۔

ڈاکٹر میں مل کر بلا گیا چارلس کو بھی ریح پانی پر اطلاع دی گئی، لیکن وہ حادثہ کرنے سے پہلے ہی اس کی طرح غصہ خور ہے ہمارا ڈاکٹر گئی، کی موت چارلس کے بچے بہت بڑا حادثہ تھا دوسرے دن البتہ نے مسز بارڈ کا خط ڈاکٹر میں مل کر دیا، ڈاکٹر نے بڑی دلچسپی سے اسے پڑھا اور کہا: ”ایسا معلوم ہوتا ہے، ہتھارے ہلکے اپنے شوہر کو تھک رہی تھی دیکھا کرتی تھی اور اس سے باتیں کرتی تھی، اسی وجہ سے اس کی موت ہوئی۔“

اگلی رات جب گھر میں سنا چھایا ہوا تھا اور سب لوگ بے خبر سو رہے تھے، چارلس آہستہ سے اٹھا اور سڑکی پر اپنی بیٹی کے کمرے میں گیا اور ایک تار پر پڑنے کے لیے کمرے سے اس کے کمرے تک چلا گیا، آہنگ لکھا۔۔۔۔۔ شام کو سنت سردی تھی، چارلس نے اپنے کمرے میں آگ دھنکی اور اپنی مسونی داڑھی اور مونچھیں اس میں پیچک دیں اور اپنے چاکے کھ پڑنے کپڑے ایک صندوق میں چھپا کر رکھ دیے، ریڈیو کی آگ چارلس کے زرخیز ذہن میں اس وقت پیدا ہوئی جب ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ کوئی معمولی سدا تھا، مسز بارڈ کی جان بے کتا ہے۔

بہر حال اس کا غصہ بے کایا، ہر ڈاکٹر بارڈ کی تہیہ و تکفینیں بخیر و خوبی ہو گئی اور چارلس پر کسی کو شک بھی نہ گذرا۔

ہندو زبیر الہ تھنے چارلس کو اطلاع دی کہ مسز بارڈ کا وکیل چلے آئے ہیں، چارلس تو اس وقت کامیابی سے انتظار کر رہا تھا، وہ دوسرے کمرے میں پہنچا، اس نے وکیل کو خوش آمدید کہا، وکیل ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور گفتگو کا

”مسز چارلس، آپ کے بے خط میرے نام لکھا، میں اس کا مطلب نہیں سمجھ سکا، آپ کو شاید یہ خیال ہے کہ مسز بارڈ کا وصیت نامہ میرے پاس ہے۔“

”ہاں، امیر اتوری خیال ہے؟ چارلس نے کہا: ”پہلی نے مجھے یہ بتلایا تھا۔“

”انہوں نے بالکل ٹیک کا تھا، ان کا وصیت نامہ پہلے میرے پاس ہی تھا، وکیل نے جواب دیا۔“

چارلس نے بے چینی سے کہا: ”کیا مطلب؟ پہلے پاس تھا اب نہیں؟“

”جی ہاں؟ وکیل نے جواب دیا: ”مسز بارڈ نے مجھے لکھا تھا کہ وصیت نامہ ان کو دلی پیج دیا جائے۔“

یہ سن کر چارلس بے چین ہو گیا۔

وکیل نے پوچھا: ”کیا آپ نے اس کی ذلتی چیزیں منیت لے کر

گمشدہ دن

ڈبلیو ایف ہاروے

”تو کیا مجھے کبھی شیطانہ قوت سے اپنا آلہ کار بنایا تھا... نہیں تو نہیں... ایسا نہیں ہو سکتا“ وہ بڑبڑایا۔



۱۳۱
علی روآند کیا جانے گا جس کی زد سے اللہ کی تمام ہائیں ملکی
و وارث اللہ کی جتنی میری ہے۔

وکیل کے جانے کے بعد چارلس بے سہریشان نگر آتا تھا۔ دو سو چار ہفتا اس کی تمام پوشیدہ بلور ہلاک کی میری کے حق میں مفید ثابت ہوئی۔ وہ خیالات میں غرق تھا کہ ٹیلی فون کی گفتنی بھی ڈاکٹر سینٹ کا فون تھا، وہ کہہ رہا تھا مسز ہاروے کی پوسٹ مارٹم رپورٹ سے پتہ چلا ہے کہ اس کا دل بے حد کمزور ہو چکا تھا اور وہ اس کا کارہ دل کے سہارے زندہ سے زیادہ معرفت و دماغ تک زندہ رہ سکتی تھی۔

چارلس نے سر پیٹ لیا۔ کاش اس نے وہ انہماک کر لیا ہوتا۔ اس کا ضمیر ملامت کرنے لگا۔ اس نے سوچا، اپنی چوٹی کو ریڈیو کے ذریعے قتل کر کے جس نے یہ ایک گناہ کیا ہے۔ اس کی راتوں کی نیند آگئی۔ — ذہن پر ہر وقت خیالات کا جھوم رہا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ اوصالی بیماری کا شکار ہو گیا ایک دن ایسی ہی پریشانی کے عالم میں ایک تحریر تیار کی جس میں اس نے ایک کاغذ پر لکھا، ”میری جی ایسی موت نہیں مری تھی، بلکہ میں نے قتل کیا تھا۔“ پھر وہ اپنے سامناٹڈ کا ایک چمچ مٹی میں ڈال دیا۔



قائن کیا ہے؟

چارلس نے جواب دیا ”جی ہاں، اور جتنے اللہ کی ذاتی پیروں میں لائی کیا مگر نہیں ملا۔“

وکیل نے الزبتھ کو گھایا، الزبتھ نے نیکیا کا مسز ہاروے کی وفات کے بعد اس نے گفتنی میں پلے ہوئے کاغذ اور رفلنے کی راکھ دیکھی تھی۔

چارلس کو اپنا دل دھتاتا ہوا محسوس ہوا۔ وکیل کے سوچ کر کہنے لگا، ”میرا خیال ہے آخری وہ فون میں مدام آپ سے خدائن ہو گئی ہوں گی، دیکھا جنہوں نے ویسٹ ٹکڑ خذہ آتش کرنے کے لیے وہاں بیٹھ کر لیا۔“

”جی نہیں، وہ آخر تک مجھ سے بے حد خوش تھیں۔“ چارلس نے لکھتے ہوئے برتنوں سے کہا۔

وفا چارلس کی آنکھوں میں جی ڈارٹر کی موت کا غم گھوم گیا۔ مسز ہاروے ایک ہفتہ سے اپنا دل بڑے بیٹھی تھی اور وہ ہر ہفتہ سے ایک کاغذ پھیل کر دیکھتی ہوئی آگ میں جا کر چارلس کا پیرہہ بالکل مفید پڑ چکا تھا، اس نے گھبراہٹ ہوئی اور زمین دیکھ کر سے پوچھا، ”اگر مصیبت نام نہ نہ ہلا تو کیا ہو گا؟“

وکیل نے جواب دیا ”آج ان کے پٹنے مصیبت تھے پر



اپنی آپ سختی ظلم برد کرنا چاہوں۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ میری زندگی عجیب و غریب واقعات و حوادث سے بھری ہوئی ہے۔ اب اتنے برس بیت جانے کے بعد اور اقیانوسا جوں تو خود مجھے تجرہ کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور بعض لحقات یقین ہی نہیں آتا کہ یہ واقعات مجھے گزرے ہیں۔ وہی پراسرار اور تیز غیر واقعات میں سے ایک واقعہ مجھے بیش پریشان کرتا رہا ہے اور ہر ازل و ہر آن اس پر سوچ بچھا کرنے کے باوجود میں اس کی توجہ نہیں کر پایا۔ جتنا غور و فکر کرتا ہوں، اتنا ہی اُلجھتا جاتا ہوں اور اس اُلجھی جوئی دور کا سراپہ سرے ہاتھ نہیں آتا۔ اگر آپ سننا چاہیں تو عرض کیے دیتا ہوں۔

اُن دنوں میں جنوبی انگلستان کے ایک خوبصورت، لیکن قدسے غیر آباد علاقے کے ایک گرجے میں ڈیوڈ ٹیلر پادی کو فرانس کہتے تھے۔ حقیقت میں یہ دونوں بہت نفیس آدمی تھے۔ بہت جلد ہم تینوں میں اُنہیت پیدا ہو گئی اور چونکہ ہمیں گھنٹے کا ساتھ تھا، اس لیے قدرتی طور پر ہم ایک دوسرے کے ذکر و حکم میں بھی شریک رہتے۔ رات، کھانے کے بعد دیر تک نشست رہتی، اُس میں دنیا جہاں کی باتیں ہوتیں، فنون لطیفہ سے لے کر سیاست تک اور سیاست سے مجوسیت پریت اور دونوں کے قصوں تک ہر موضوع ہماری دسترس میں ہوتا بعض لحقات ساری ساری رات انہی باتوں میں کٹ جاتی۔ کوئی فکر قادرِ دیر پریشانی، ایسی ہی ایک رات کا ذکر ہے۔ ہم تینوں نادیدہ مخلوقات کے بارے میں سرگرمی سے بحث کر رہے تھے کہین کہہ رہا تھا: "میں آپس میں ایک راز کی بات بتاتا ہوں یہ وہ راز ہے جسے اکثر بڑے بچے لکھے لوگ بھی نہیں جانتے اور وہ یہ ہے کہ مافوق الفطرت قوتیں خود بھی مصروفِ عمل ہوتی ہیں اور کبھی کبھی وہ ہم جیسے انسانوں کو بھی اپنا آلہ کار بنالیتی ہیں۔"

تھک! یہ بات سنتے ہی میں نے گہرے عجیب وقت: بعض عمارتوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ وہ دوسروں کے ذہن پر اثر انداز ہو کر انہیں اپنا آلہ کار بنا لیتے ہیں اور پھر اپنے معمول سے ایسے ایسے کام لے لیتے ہیں کہ اسے غریب نہیں ہوتی۔ مثلاً، ایسے افراد چاہیں تو اپنے معمول کو حکم دے کر اس سے قتل تک کر سکتے ہیں۔

فرانس جیسے نہ ہو کہ ہم دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا آخر اُس نے کہا: "خدا رکھ کر دے! یہ تم لوگ کیا کہہ رہے؟" میں نے بات کبھی نہیں مان سکتا... خدا نے انسان کو قدرت قوتیں اور صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ کوئی اور مخلوق خواہ وہ کتنی ہی مافوق الفطرت کیوں نہ ہو کسی انسان کو اپنا آلہ کار نہیں بنا سکتی۔ انسان کو یہ دورِ حال ہے کہ وہ دونوں کو طلب کر سکتا ہے اور غیبتِ شیطانی طاقتوں کو زیر کر لیتا ہے، بلکہ وہ چاہے تو اُن سے اپنے کام بھی نکالوا سکتا ہے... ہم یہ ممکن نہیں کہ کوئی غیبتِ ذریعہ کسی انسان پر غلبہ حاصل کرے اور اُسے اپنے مقاصد کے تحت کما کر نہ پر مجبور کر دے... البتہ میں اتنا مان سکتا ہوں کہ غیبت قوتیں اکثر اوقات غیبت افراد کے قریب آجاتی ہیں..."

ہم دونوں نے فرانس کو اپنی بات پر قائل کرنے کی بڑی کوشش کی، لیکن وہ دانا... آخر جنگ اُگریں اُٹھ کھڑا ہوا اور میں نے کہا فرانس! بد شک تمہاری قوت یہ حقیقت تسلیم کر دو، مگر ایک دن ایسا آئے گا جب تم اس کے قائل ہو جاؤ گے۔ اس کے بعد ہماری نشست، ہفتا ہفت ہو گئی اور ہم اپنے اپنے کمروں میں آرام کر لے چلے گئے۔

۱۳۷

اگلے پختے مجھے سالانہ چٹھیاں ہونے والی تھیں۔ کڑی کڑی برسوں سے یہ پروگرام لے چکا تھا کہ ہم تینوں باری باری چٹھیاں لکھ کر کہیں گھونٹے جایا کرتے تھے۔ اس کے دو مقاصد ہوتے ایک یہ کہ ہم کدیم پھر کر تفریح کر لیتے

ہوں۔ اول تو یہاں مجھے فکس کا احساس ہی کم ہوتا ہے اور اگر کسی ایسا ہو جائے تو میں فوراً اُس کھڑکی کے نزدیک جا کھڑا ہوتا ہوں جو باغ کی جانب کھلتی ہے۔ باغ خاصا وسیع و عریض ہے اور اس میں طرح طرح کے پھول پودے اور درخت لگے ہیں۔ میں ہیشہ اس باغ کی تازگی اور شاہابی کا خیال رکھتا ہوں اور اسی لیے یہ باغ بھی میرا خیال بندھتا ہے۔ چند لمبے باغ کا نظارہ مجھے مل میں طراوت اور صاف میں فرحت بھرتا ہے۔ میں دوبارہ تازہ دم ہو کر اپنی میز پر آجاتا ہوں اور کھانا شروع کر دیتا ہوں۔

آپ پوچھیں گے میں ان دنوں کیا کھا رہا ہوں۔ چننا

اپنے مکان کا جنوبی کارڈور بہت چمکے ہے، شاید اس لیے کہ کتے نہ ہوں۔ سکون اور یکسوئی کی مجھے ضرورت ہوتی ہے، وہ یہیں نصب ہوتا ہے۔ کتے ہی ہیں کہ ایک پڑھنے لکھنے کا شغل رکھنے والے شخص کے لیے تنہائی اور یکسوئی کتنی بڑی نعمتیں ہیں میں یقیناً اس اعتبار سے بے حد خوش بخت آدمی ہوں کہ مجھے ایسا مکان مل گیا ہے جس کا جنوبی کارڈور نہایت پرسکون ہے۔ میں نے اپنی میز پر بھی لگا رکھی ہے اور پرسکون ماحول میں کسی قسم کی دخل اندازی کے بغیر میں اس جگہ گھنٹوں کھتا اور پڑھتا رہتا

اپنا ایک ٹیلہ نمودار ہوا جو دودھ تک چلا گیا تھلپیل چلتے چلتے میری ٹانگیں جواب دے گئی تھیں۔ یہاں رات بسر کرنے کا تین تصور ہی نہ کر سکتا تھا۔ میرے پاس پانی بھی ختم ہو چکا تھا۔ اس لیے ٹیلہ دھوم مہینچے کے ساتھ کھائی نجات کی راہ نہ تھی۔

میں بخوبی بددی پر ختم تھی اور میرے بچے اتنی لمبائی پر سے نیچے آیا تو ویسا ہی بڑا سا ٹیلہ میرے سامنے تھا۔ اپنا ایک انہلے سے خوف اور وحشت نے مجھے اپنی ہیبت میں ملے لیا اور تنہائی کے شدید احساس سے میرے دھڑکنے لگے۔ ہو گئے میرے اٹے ہوئے قدم غور بزدل گئے جیسے انہلے زمین نے جکڑ لیا ہو۔ میرے لیے یہ فعل کن شکل ہو گیا کہ میرا لگاتار آگے کی طرف بڑھنے لگا۔ میں اپنے کوس پر قابو پانے کی سرزد کرکشی کی، لیکن کبھی میں اس دھڑکنے پر تھکے پہلو سے راستہ کاٹ کر گڑا تو کیا کرتا ہوں

کہ ایک لاش چھت پڑی ہے۔ یہ ایک سیاہ خام واز قذوق تھا۔ اس کے گھٹنے بال بھوئے ہوئے تھے۔ انہیں پوری طرح گھٹی بیٹے کی لکڑی رہی ہوں انہیں خام وازوں میں سے پھیلے ماتر ہوا ہے۔ تھے گردن پر ایک پشیمان کلاف پہنا ہوا تھا اور کالوں میں ملاقوں کی ہی بالیاں تھیں۔ اس دھڑکنے میں ایک لاش دیکھ کر خوف اور وحشت سے میرا برا حال تھا اور پھینکے قطرے میری پیشانی سے بہہ نکلتے تھے۔ اس کے بعد ہوا میں آگے بڑھا اور لاش کو قریب سے دیکھنے لگا۔ لیکن تھا کہ

اُسے مرے ہوئے کئی دن ہو چکے ہیں۔ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ سرواٹھ لٹکی ماند رہ گئے تھے۔ ہیزنگ کی قمیص پھرتے پھرتے ہو چکی تھی اور لاش کا سینہ بڑی طرح فوجا کھو گیا تھا۔ گھبراہٹ اور پریشانی کے باوجود میرے ذہن میں عجیب سی تصویر سامنے رہی جیسے کئی بڑا سا طوطا پر پھیلائے سرہا ہو۔ میں نے اپنا تھیلہ زمین پر رکھا اور لاش کے پاس بیٹھ کر اس کا ہور جاننے لگا۔ جو بھی میں نے اس کی کھٹ بدل کر دیکھا تو اس کی کھوپڑی پر بہت بڑا اور گراں قدر لکڑیا ہوا شیدہ کی

غور پر سنا تھا تھا۔ دیر تک اس دھچک دھچک سے باتیں کرتا رہا۔ اگلی صبح صبحی پھٹنے کے روز میں ایک ایسی ہیر پرتھل کھڑا ہوا بہت پر لطف سماں تھا۔ سمندر کی لہروں سے اٹھتی ہوئی چوڑی ہیرے سے آگے نکلتی تو مجھے بہت ہلکا لگتا تھا۔ میں اس ششدری ششدری چوڑی سے اس وقت تک لطف اندوز ہوتا رہا جب تک میرا راستہ مشرق کی طرف نہ مڑ گیا اور میں اس سرسبز پہرہ لیا جو تلخ کے آخر تک جاتی تھی۔ میں ایک چھوٹے سے راتے پر چل پڑا جس پر خشک خاردار جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ راستہ استعمال نہیں ہوتا۔ دوسرے ہونے

تک میں طعرتی سب سے اونچی چٹان پر پہنچ چکا تھا۔ جو کہ کے دوسرے سرا برا حال تھا۔ ایک جگہ ٹھیک اور قیلے سے سینہ وچ نکال کر کھانے لگا۔ اس کے بعد اپنی سمت کا جائزہ لینے کے لیے نقشہ نکالا۔ مگر اسے ٹھنڈا تھا۔ سہل نہ تھا۔ ایک تو میں ابھی اور میرا علاقہ ایک کسی ہی پڑی پڑی تھا۔ راستوں سے ٹھیک۔ پھر بھی میں نے مختلف نشانوں سے اپنی پوزیشن کا اندازہ لگا لیا۔

تھکے سے ملاقوں کی شیدہ ہوم کی بستی نزدیک ترین جگہ تھی جہاں میں رات بسر کر سکتا تھا اور جہاں میں نے مشکل کی رات گزاری تھی۔ میں کسی قدر تھک کے بغیر شیدہ ہوم کی طرف چل دیا۔ اس وقت دن کے دو بج چکے تھے۔

مجھے رات تلاش کرنے میں خاموشی و دشواری پیش آئی رات چلتے چلتے اپنا ایک بند ہو جانا اور قوی نہیں چٹانیں کھڑی منہ چڑا دی ہوتیں۔ اور کبھی اپنا ایک تین چار سمتوں میں ایک وقت دتے کھلے گئے اور ان میں سے کوئی ایک کا انتخاب شکل ہو جانا۔ میں نے اندازے کے مطابق جنوب کی طرف سفر جاری رکھا اور خدا کا شکر ہے کہ آہستہ آہستہ پتھروں اور چٹانوں کے ساتھ میں کی گئی لگی اور زمین ہموار ہوتی چلی گئی۔ یہ اس بات کی دلیل تھی کہ میں صحیح راستے پر چل رہا ہوں اور آبادی قریب ہے۔ لیکن



گھومنے پھرنے کا فیصلہ کیا۔ چھٹی سرائے کے پورے ایک سڑ روٹس سے ایک ڈھیری پسی آدمی اور سہ پہر تک چلی کے شکار سے خوب جی ملتا رہا۔ اس سیر سرائے کے دوران ایسٹری کے کیمپ کے لیے بہت لمبی جگہ میری پسند آگئی۔ یہ جگہ ریپ نمودار گزری تھی۔ بعد کی رات میں نے وہیں ریپ نمودار گزری اور عمارت کو میں فریکٹ مٹی اچھی کی بستی میں چلا آیا اور رات کا کھانا وہاں کے گرجا گھر کے پادری کے ساتھ کھایا جو لیگ کا ہر جامت رہ چکا تھا۔ بڑی دیر تک ہم باتیں کرتے رہے۔ جیسے کالوں میں نے گاڑی میں گزارا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ گاڑی سرائے کی ناکھنے طوٹے کا پتھر ہونے کے میں لگا لگا تھا۔ طویل عرصہ تک

اور پھر سال بھر کے لیے تروتازہ ہو جاتے۔ اور دوسرا ایک دفعہ دن کے علاقوں میں ایسی جگہ مقصد کر لیتے جہاں نوجوانوں کی اخلاقی اور مذہبی تربیت کے لیے سلاخیں لگا سکیں۔ اب کے پختی کی باری میری تھی اور میرا خیال تھا کہ یہ پختیاں ڈیڑ ساڑھیں اپنے چچا کے ہاں گزار دی جائیں، ان کے ہمراہ شکار کھیلنے جاؤں اور ساتھ ہی ساتھ کیمپ لگانے کے نقطہ نظر سے اور دگر کے مضامین کا جائزہ بھی لے لوں۔ اپنا بچہ اگلی صبح میں ڈیڑ ساڑھیں ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر مجھے سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ کسی کے پاس بہت کرنے کے لیے برمی وقت دینا انداز میں نے اچھے ہی روز کو حق کرنے اور اکیلے گھومنے پھرنے کا ادارہ کر لیا اور ایک ایسے بے رونق اور ساحل علاقے کا انتخاب کیا جہاں کی آبادی چھوٹی چھوٹی بستیوں میں اور ہر قسم کی پھیلی ہوئی تھی۔ اصل میں ایسے ہی علاقوں کے نوجوانوں کو رہائش کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے ڈنڈے تک دس دن کا دلہی دلوئے نکٹ لیا اور سفر پر روانہ ہو گیا۔ نکٹ پر پائیں تہر ہر دوسرا کی ٹھہر گئی تھی۔

میں جب ڈنڈے پہنچا تو ساحل علاقہ تو حق چھوٹے چھوٹے جہانوں اور کشتیوں سے پٹا پٹا تھا۔ جوشا کی طوفان کی تھک گئی کے سبب اس چھوٹے سے ساحل پر آگئی تھیں۔ پورے قصبے میں چھپے ہوئے اور کھوکھلی آمد صدف سی ہو گئی تھی۔ میں بھی ڈنڈے کی ایک کشتی سرائے میں ٹھہر گیا۔ رات میں نے میں گزار دی۔ اگلے روز میں منگل کے دن ایک مختصر سفری قیلا لیے چٹانوں کے ساتھ ساتھ ساحل سمندر پہنچنا شروع کر دیا۔ شام کا دھند لگا چھا جانے کے بعد مجھے ایک اجنبی کسان کی بیل گاڑی میں بیٹھ مل گئی جو شیدہ ہوم تک جا رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر میں نے وہ رات شش سرائے میں گزار دی۔ اپنے چرچ سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر تھی۔ اگلی صبح یعنی بدھ کے روز میرا موڈ آنے جانے کا دین سکا اور میں نے اس دن اسی بستی کے قریب و جہاں میں

گھٹائے یا پھر سے لگایا تھا۔

میں نے پولیس میں رپورٹ کرانے کا فیصلہ کر لیا۔
نزدیک ترین پولیس اسٹیشن شیڈز ہوم میں تھا۔ شیڈز ہوم
میرے انداز کے مطابق ابھی دس دن دور تھا۔ اب میں
نے دوڑنا شروع کر دیا کیونکہ وقت سر پہرے ہی کچھ آگے
نکل چکا تھا۔ کوئی دو تین میل کی دور کے بعد چھوٹی سی ریلوے
لائن دکھائی دی جو غالباً کوئلے کی کان سے کوئلہ لانے والی چھٹی
ٹریک کی تھی۔ تھوڑی ہی دور چلا تو ان لوگوں کا گھر دور سے انہیں کی سیٹی
سنائی دی۔ یقین کیجیے اس خوشی کو میں آج تک دھڑل نہیں کر سکا
جو اس وقت انہیں کی دل کی تھڑکیوں سے رگ دپے میں دوڑ گئی
تھی اور اعصاب شکن تنہائی اور سکوت کا طعم کھانے کا ایک لمحہ
میری رفتار میں کچھ کی واقع ہو گئی تو میں سوچنے لگا کہ وہ نصیب
شخص کون ہو سکتا ہے اور اس سے آدابہ کیا کہنے کا آیتا تھا
اور اگر کسی اور جگہ تھکنے کے اسے یہاں بھی لگا لیا ہے تو فالتو ہے
اس کی لاش اس طرح کھلی کیوں چھوڑ دی۔ وہ آیتے آسانی سے
کسی چٹان کی دھار پر کھو میں دفن کر سکتا تھا۔ اس کے لیے کسی
خاص تہذیب کی ضرورت ہی نہ تھی، صرف ایک چھوٹا سا گھر یا کائی
ہوتا۔ سوچتے سوچتے میں شیڈز ہوم کے قریب پہنچ
گیا تھا اور آبادی ایک میل سے زیادہ دور نہ تھی، پانچ ایک
گر جاکر کے گھنٹے نے سکوت توڑ دیا۔ سن... سن... سن...
ہائیں! جھپٹے کے دو گر کے گھنٹہ کیوں بج رہا ہے؟
شیڈز ہوم جیسی چھوٹی جگہ پر تو میرے ڈسے سروس کا سوال
ہی پیدا نہیں ہوتا اور غیر دو تین گھنٹوں کا انتظام بھی اتنی چھوٹی
جگہوں پر شام کے وقت نہیں ہو سکتا۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے؟
جھپٹے کی شام اور گر کے گھنٹہ! کیوں؟ ہاں شیش وینچ میں
آجھا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ہنسی کا بازار آگیا تھا اور یہ دیکھ کر
میری ہر سٹ کی انتہا نہ رہی کہ تمام دکائیں بند ہیں اور لوگ
اتار کے مخصوص لباس میں ادھر ادھر آ جا رہے ہیں۔ میں
نے سب سے پہلے پولیس اسٹیشن تلاش کیا۔ یعنی اس کا فیصلہ
کا جو منہ ہوا جو گھٹا اس آبادی میں پولیس اور کسی حد تک ملا

کا کام سنبھالے ہوئے تھا وہ چھوٹے موٹے جھگڑے وہیں
لوگوں کے سامنے پیش کیا کرتا تھا اور یوں بادشاہ ہینڈ آف
رپورٹ کے لیے جانے سے بچ جاتا۔ آبادی میں بھی اس
قائم تھا۔ کالج کے دروازے پر پہنچ کر میں نے دستک دی
تو اندر سے ایک ادیب اور عورت نکلی جو کانسٹیبل کی بیوی
تھی، اس نے بتایا کہ مسٹر کانسٹیبل گھر پر موجود ہیں اور وہ ابھی
صبح آئیں گے۔ کچھ گھنٹے کا فائدہ نہ تھا۔ عجیب سی بات یہ کہ
جس واقعے کی اطلاع دینے میں پانچوں کی طرح دوڑنا پڑا تھا
اس کی اطلاع نہ دینے پر مجھے طمانیت کا احساس ہوا جیسے
میر کوئی بہت بڑا راز افشا ہونے سے بچ گیا ہو۔ جیسا پانی
اس کی کیفیت پر خود ہی حیران ہوتا ہوا سیدھا شیشی سر لے
میں چلا آیا۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ میں نے دو تین مرتبہ
دستک دی تب کہیں جا کر سر لے کے کوڑی ہوئی، بالکل سواد ہوئی۔
اس نے مجھے فوراً پہچان لیا۔ بولی: آؤ آؤ تمہیں جگہ مل سکتی ہے
اتفاق سے تمہارا پہلے والا نمبر تین کیسین خالی ہے، میری ٹیلی
پر کمرہ کھلے جاؤ۔ لڑکائی باہر گئی تو میں اس لیے کھانے
کو کچھ موجود ہے۔ تمہیں وہی لینا پڑے گا۔ ٹھیک ہے،
کوئی بات نہیں کہہ رہی، اسی کہیں میں چلا گیا۔ اور
منہ ہاتھ دھو کر واپس آیا تو میرے شیڈز ہوم کا نگار بھی تھیں۔
میں آتش دان کے قریب بیٹھ گیا کہ کوڑی ہوئی کا سر بھی بڑھ گئی تھی۔
میرے شیڈز ہوم لگاتے ہوئے ساتھ ساتھ ادھر ادھر کی باتیں
بھی کرتی جاتی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں: دراصل تمہارے ان
گاہک صرف موسم بہار اور سربوں کے شروع میں آتے
ہیں باقی سارا سال ہم افلاس میں کاٹتے ہیں۔ یہ چھوٹا سا
گلوں بہت ہی قابلِ دھم ہے۔ انہیں تو ایک مسافر سے
بھی بہت فرق پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ہر وقت والے
کی خوب پہچان ہوتی ہے۔ کوئی ایک مرتبہ شہر چلے تو
ہم اُسے پہچاننے میں تمام عمر غلطی نہیں کر سکتے اور آپ تو
پھر ابھی پچھلے منگل کو یہاں تھہرے تھے۔ اچھا جناب! یہ
وہ آپ کا کمانا۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو گھنٹی بجا دینا۔

دو جانے کے لیے بڑی ہی جی کر میں نے کہا: وہ تو سب
ٹھیک ہے، میرے شیڈز ہوم کی کیا بات ہے آج سرنے میں
بڑی خاموشی چھائی ہوئی ہے، میرا خیال ہے کہ جھپٹے کی شام
تو بہت دش ہو رہی ہے؟
آواز کو ہم زیادہ بڑبڑ نہیں کرتے صرف باہر سے
اگر تھہرے والے مسافروں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ہمارا
لائسنس چر دن کا ہوتا ہے تو اگر کوئی چھٹی کرتے ہیں۔ معاف
کہ مجھے شاید کوئی بتو چلا رہا ہے۔ اس وقت میں اپنی کام
کے لیے گھر لڑکیاں چرچائی ہوئی تھیں کہ وہ بدلتی سے
اندھ کی لڑکیاں چرچائی ہوئی تھیں کہ وہ بدلتی سے
تو آج اتوار ہے جیسی۔ ہمارا کھانا منظر میرے سامنے گھوم
گیا جو واقعی تو ایک شادی کر رہا تھا۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو
سکتا۔ ابھی صبح ہفتہ تھا اور شام کو اتوار کیسے ہو گئی؟ ہٹا سنے
کیلنڈر پر نظر پڑی تو اس کی تاریخ بدل ہوئی تھی۔ اتوار انہیں
ستمبر ۱۷ کو گذر چکا تھا کہ گھر کی گھنٹی بجے ہوئے تھی سن چکا
تھا۔ لوگ اب دھڑلے سے اتر آ رہے تھے۔ اس وقت سے گھر پر پہرے
تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آج ہفتہ نہیں ہے، مجھے غلطی لگی
ہے اور پچھلے ہفتے کا کوئی ایک دن میں نے کسی مناج کو دیا،
لیکن کھانے کے لیے نہ پریشان ہو کر کوئی پکوانی ڈالنی نکالی۔ ہر
تاہم لگے گئے اس دن کا منظر حوالہ دے رہا تھا میرا خیال ہے
مجھے اپنے سفر کے آغاز کی تاریخ دیکھنی چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ
دو دن کے میں مجھے غلطی ہوئی ہو اور اسی ترتیب سے میں
ڈالری میں غلطی نہ کرتا رہا ہوں۔ میں نے اپنے منگ کا وہ
چھینا آواز نہ کھل کر دیکھا جو جیکنگ کے بعد مجھے واپس لیا گیا
تھا۔ یہ اس منگ کا ثبوت تھا کہ واقعی میں نے اپنا سفر بدلتا رہا
ہائیں خبر کو مشورہ کیا تھا۔ رات ڈولنے میں سویا تھا اور منگ
کو شیڈز ہوم کی اسی سرنے میں تھہر رہا تھا جہاں میں اس وقت
موجود ہوں۔

بعد، وہ پہرے اور جمعرات، فریڈک سنون لکھیں
اور مجھے کا دل میں نے گھر میں گزارا لگے دن یعنی آج

صبح، جھپٹے کو گاڑنے سے کچھ کیا تو رات میں لاش کی ہر سٹ
اتوار دینے مجھے شیڈز ہوم آنا پڑا لیکن یہاں اگر معلوم
ہوا کہ آج اتوار ہے۔ آخر یہ سب کیا ماجرا ہے؟ میرے
ہر دن کی مصروفیت کا حال میری ڈالری میں درج ہے حتیٰ کہ
سرافوں کے بل وغیرہ تک موجود ہیں۔ پھر یہ پوسٹ میں
گھنٹے کا ایک دن کہاں گھوڑا میں نے؟ میں سوچ سوچ کر
چکارا دیا تھا اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ کسی بھار
کی چھوٹی موٹی بدحواسی کے سوا جو ہر بدل انسان سے
ہو سکتی ہے مجھ سے اتنی بڑی بدحواسی کبھی سرزد نہ ہوئی
تھی۔ میں باہر باہر گزشتہ جھپٹے کی مصروفیت یاد کرتا، لگتا کہ وہ
بہر دور ڈال، یہ بات کسی طرح منتقل نہیں ہوتی کہ آج صبح جھپٹے
کو چلا تو شام ہو رہی تھی اتوار کیسے لگتی۔ میں جتنا سوچتا
آتا ہی اُجتنا اور پریشان ہو جاتا۔

کمانا ختم کر کے اپنا ہیٹ اٹھایا اور سرائے سے
باہر نکل گیا، جلدی جلدی گر جاکر کی طرف روانہ ہوا، گیٹ پر
اُگ کر سگریٹ سٹگانے کے سامنے اتار دیا۔ آگے والی
آواز پر کان لگا دیے۔ واقعی یہ پوری کے ڈھائی کلمات
کی آواز تھی، اس کا مطلب ظاہر تھا کہ اندر اتوار کی علامت
ہوئی ہے جو اب ختم ہونے کو تھی۔ میں ایک عجیب الجھن
اور ڈپریشن کے بوجھ تلے ہاتھ بھاری قدموں سے چلتا، واپس
سرائے میں آیا اور یہ حال اپنے کہیں میں چلا آیا اور سوچنے
لگا کہ یہ سارے کا سارا قصہ میری شدید غلط فہمی کا شکار ہو
گیا ہے۔ ان سب کی یادداشتوں کو کیا ہو گیا ہے؟ خدا کا شکر
ہے کہ میری یادداشت درست ہے، خواہ وہ سب کے
سب مجھے پاگ کیے دے رہے ہیں۔ اس خیال نے وقتی
طور پر مجھے تسکین مند کر دی اور میں بستر میں لیٹ گیا لیکن وہ
دھڑکنے میں آگئے، دالے سوالات، ہائے نہا کے۔ ہانک
میری نظر بستر میں پڑنے کے کچھ ہسپتال کے خیرات کشیں
پر جا پڑی جو مسافروں کے لیے تھکا ہوا تھا کہ وہ سب تو خیر
مقامی رہنماؤں کے لیے کچھ خیرات اس میں ڈال جائیں، کشیں کا

خیال کو جس کی طرح پرکھا گیا کہ میں نے اپنی کشتی کو ایک دھوکے میں روٹا دیا تھا بات کا سبب اور اس کی ادائیگی کا معراج چہ شاید وہ اس شخص کے محل کرنے میں کچھ مدد کرے۔ میں نے جلدی سے اپنی کشتی کو نکال دیا اور میری مہربانی سے وہ قی نے پہلی نفر میں چھپ کر کسی معلوم عمارت کا آبی بستیوں اور سڑکوں کے بل تھے جہاں میں اپنی یادداشت کے مطابق وقت گزار چکا تھا۔ کوئی نیچا بیٹا تمام سامنے نہ آیا۔ میں نے دوبارہ خدمت پر پھنسا شروع کیا۔ ایک عجیب سی بات سامنے آئی کہ شید زوم کے بل کی افشانی دینی درج تھی۔ گویا میں نے اس شخص کے علاوہ بھوکہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ اب میں نے فیصلہ لیا کہ جہاں اور سریشٹو کو نہیں کے جسے کا افسوس دینے کے بدلے نکال دیا اور جب وہ اندر لے کر پہلے گئیں تو میں نے جگہ پر پہنچائی سے سوال کیا: "سریشٹو میں جہاں پہنچے کس دن کا ہے؟" اس کے بعد میں نے کہا: "جنگ!"

جنگ! ہٹل اور بڑھکی رات آپ یہاں ٹھہرے تھے اور جملہ کی میسر میں سے پروردگار نے ہو گئے تھے۔ اچھا! جنگ! شب بخیر! رات آٹھ آپ کو جگہ کا نام پزل جانے گا۔ یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

میرا خیال درست نکلا کہ بڑھکی رات ہی ساری گزرتی تھی۔ جب اور میرا دل شید زوم ہی میں کھویا ہے۔ سریشٹو کے دھوکے سے ایک بات صاف ظاہر تھی کہ شید زوم، اس دن ایک جملہ آدمی کی طرح رہا ہوں گا۔ کوئی حرکت مجھ سے ایسی سرزد نہیں ہوئی جس کی بنا پر سریشٹو کسی شیبے میں مبتلا ہوئی۔ ایک اور بات یہ بھی تھی کہ میں نے وہ سامان باہر گھونٹنے پھرے میں گزارا ہوگا اور اس بات کو اگر سوراخوں کا گویا نگاہوں میں دیکھ کر ہر کے کہنے کا ذکر نہیں تھا، تاہم یہ انہیں اپنی جگہ برقرار رکھی کہ وہ دن کس صورت میں میں گزارا ہوگا۔ اسی اور میری میں سال سے فوجی تھے۔ شید زوم کے کوسوں دور تھی اپنی قہر پہلے اور نیند لائے کی بنا پر میں نے کچھ پرے کی صفائی اور سامان پورے شیعہ اٹھا کر ہٹل کے سامنے رکھ لی۔ اس

چھوٹے سے کمرے میں جہاں خدمت کی ہر چیز ہوئی ایک چھوٹا سا شیلٹ کن لیں کا بھی تھا جس میں پانچ سات کن لیں اور کچھ پرانے رسالے رکھے تھے۔ انہی پرانے رسالوں میں سے میں نے ایک پرچہ اٹھا لیا اور اپنے بستر پر لیٹ کر ایک کمانچینی شروع کی اور آخر تک تمام کر ڈالی۔ اس میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ کمانچی کے آخر میں پورے صفے پر ایک تصویر چھپی تھی جس پر جڑی درخت تھا: ایک ایسا منظر جسے وہ بھی نہ بھلا سکا۔ تصویر دیکھ کر میرا دل پرکاساں اور پراپنے کا کچھ رہ گیا۔ کئی ایسے خدا! یہ تو جو بودی منظر تھا جو میں کبھی دیکھ کر ہاتھ کا ایک شخص ایک قدر کی تلاش پر بھٹکا ہوا بالکل ایسی امانت سے دیکھ رہا تھا جیسے میں آج اس دیر ملنے میں گھنٹوں کے بل جھجک کر کس تلاش کو دیکھ رہا تھا۔ اس سے بھی زیادہ دل بلا دینے والی بات یہ تھی کہ تصویر میں متوال کی شکل و شایستہ اور علیحدہ ہی دی تھا اور وہی کئی اکسیر تھیں اور جیت لینے کا امان اور کانوں میں بائیں بھی ایسی انداز کی تھیں۔ میں بتائیں سکتا کہ وہ تصویر دیکھنے کے بعد میری کیا حالت ہوئی۔ کا تو تو بدن میں ہونے لگی۔

ایک احساس جرم جانے لگیوں میرے منہ پر جھٹک رہا گیا میری یادداشت کا کھو ہونا اور پھر ویرانے میں تلاش کا دیکھنا اور پھر اسی تلاش کی تصویر ایک پرانے رسالے میں پا لینا، مضمون کے پیچھے کچھ نایابہ عوامل کا فرما میں اور ان کا میری ذات سے کچھ بھی نہ تھیں مگر وہ ہے۔ اور، تو کیا واقعی میں کسی ان دیکھ طاقت کا ذکر کر نہیں، میں راہ کیسے کا چہرہ میری نظروں کے سامنے نمودار کیا جو کہ رہا تھا ایک ایک ڈانکے میں میری بات کے قائل ہو جاوے۔ میں کس کا ذکر کرتا تھا، اور کیوں تھا، یہ تو میں نہیں جانتا تھا، لیکن اس پاگل کر دینے والی الجھن سے نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ میں پولیس کو اس لاش کی اطلاع کے علاوہ اپنی یادداشت کے کھو جانے اور دوسرے حیران کن واقعات کا ذکر بھی کر دوں۔ کہیں خیال آتا کہ میں ہے پولیس اپنی قیاسی کا آغاز ہی مجھ سے کرے اور میں غواہ خواہ کی مصیبت میں مبتلا ہو کر کسی دوسرے کی سزا جھگٹے

پر میری ہواؤں پھر سوچتا کہ اپنے آپ کو حیرت کی سزا سے کالے کاہی ایک راستہ ہے۔ اگر میرا اس دھوکے سے کوئی تعلق نہیں تو خود کس بات کا؟ وہ شہادت کے نام میری روح میں کھینچے رہیں گے۔ یہ فیصلہ کر کے میں اسی دن سے بستر پر لیٹ گیا۔ جانے کب میری آنکھ کھلی گئی۔

صبح کے نو بجے میں نیند سے بیدار ہوا۔ کمر کی میں سے سون کی کریم چھٹک چکی تھی۔ پتلی شید کر لینے سے میری طبیعت خامی تر و تازہ تھی اور دل کے خون رنگ خیالات اب صحن غائب کی طرح لگ رہے تھے۔ میں نے سر پہلے سے اٹھا کر رسالہ داپس اسی شیلٹ میں رکھا اور شیلٹ نے میں گھس گیا۔ نیا ہو کر باہر نکلا تو سریشٹو کو جیسے سمیت عمارت نکلیا۔ "میں کچھ سرسرا گیا آپ آج بھی گھونٹنے جا رہی گے؟ اگر پسند کریں تو کچھ سرسرا دیاں کی پزل وغیرہ تیار کر دوں؟" "ہاں، سریشٹو! بالکل ٹھیک ہے۔ میں شام کو چار پانچ بجے سے پہلے نہ زورٹ سکوں گا۔"

"بہت بہتر سرسرا دیتے ہوئے سریشٹو دھوکے سے نکل جائیں اور جو بھی میں نے ناشہ منگوا لیا، وہ سریشٹو کا پیکٹ سے کچھ لگیں۔"

تقریباً گیارہ بجے میں سراسے سے باہر نکل گیا۔ پھر نہ دیکھتا تھا میرے قدم خود بخود کیلے لگتے پر اٹھنے کے اور میں نے کوئی مزاحمت ہی نہ کی۔ آخر کار میں اس چٹان تک پہنچ گیا جہاں میں کل دھیر تلاش دیکھ کر گیا تھا۔ میری حیرت کی کوئی اتنا بڑی کتاب دیاں کوئی تلاش تھی نہ اس کا کوئی نشان۔ میں جلدی سے چٹان کے اوپر چڑھا اور قدر قدر تک دیکھتا، اگر شاید اسے کوئی جانور اٹھا کر لے گیا ہو لیکن قدر نظر ایسی کوئی ملا نہ ملے۔

میرا یہ ساقیاس ہی تھا کہ شاید میں نے کچھ پہنچنے میں غلطی کی ہے اور میں ہی کسی ملحق چٹان پر آگیا ہوں۔ تب میں نے جھجک کر اپنے ہی قدموں کے نشان تلاش کرنا چاہا۔ میرا غوراً

اپنے دونوں کے نشان پہنچے۔ یہ جو ہیں ایک جگہ تک کر میرے آنے والے راستے کی طرف تڑپتے تھے۔ اب اس میں شک کی ذرا گمانش نہ تھی کہ جگہ پر تھکا ہوا ہے۔ تو پھر تلاش کہاں گئی؟ میں ممکن ہے کہ یہاں سرے سے کوئی تلاش ہی نہ ہو۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اپنا دماغ گھومتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ پھر ایک خیال کو اندسے کی طرح پرکھا کہ قیاسی انداز میں تو ان جگہ پر کچھ ہے اور یہ سب کچھ میرا اپنا ہی کیا دھرا ہے۔ میں اس وقت متعلق طور پر دوسرے کی کیفیت میں تھا۔ میں نے کچھ کھنڈوں کے بل جھجک گیا اور غلے بزرگ دھڑ سے دم کی ہیکہ لگنے لگا اور پھر اٹھ کر دو جملہ قدموں سے واپس شید زوم پہنچا۔ راستے میں فیصلہ کیا کہ میں کی اپنی چٹانی تمام کرالوں گا اور واپس جا کر کسی اچھے خورد و سپینٹ سے اپنا مایہ کرالوں گا۔ مزید اذیت برداشت کرنا میرے بس میں نہیں۔

سراسے میں پہنچ کر میں نے تھوڑا سا آرام کیا اور اسات کا کھانا کھانے کے بعد بہت دیر تک ایک باقی باقی سے بائیں کرتا رہا۔ میں جب نیند سے بیدار ہونے لگا تو آشوک اپنے کہیں میں آگیا جہاں کچھ اور پرا سراد و اقامت میرے قریب میں تھے۔

اگلی صبح ناشتے کی میز پر بیٹھا تو سریشٹو نے مائدہ اخبار لا کر رکھ دیا۔ جوتی میں نے اخبار اٹھا کر دیکھا میرے ہاتھ سے کانا چٹک کر ٹپٹ میں گر گیا۔ اخبار بدھیم کو توڑ کا تھا۔ اگر میرے حساب سے آج مشکل تیس ستر کا دن تھا۔ بدھیم کے ظہر میں ناشتہ اچھا اور چھوڑ کر میں اٹھ کر کھانا کھا کر اسے میں آگیا۔ میرے چہرے کے قیاسات سے شاید سریشٹو نے بے جا کچھ میری طبیعت پر پانک کلاب کر گئی ہے۔ وہ جھٹ پٹ ٹھنڈے مشروب کا گلاس لیے میرے پیچھے پیچھے کمرے میں چلی گئی۔ "میرا خیال ہے سارا آپ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ آپ آرام کیجیے اور یہ مشروب پیجیے۔" میرے بعد کچھ دیر بعد کچھ تھک دھوکے کو بالائے طاقت دیکھتے ہوئے میں نے کہا: "سریشٹو! جانے کچھ کیا ہوتا جا رہا ہے۔ میں اپنی یادداشت کو یاد ہوں۔"

مجھے کچھ یاد نہیں کہ کھلکھلی کوئین کی میں کیا کرتا رہا۔

۱۹۱۰ء، گھبراہٹ میں نہیں، جواب دیا یہی باتا ہے۔ خدا آپ پر رحم کرے! میں آپ کو تائی تھن کی آپ نے ملا دن ساری چالوں میں گزارا جس ناشتے کے وقت میں نے آپ کو ساتھ لے جانے کے لیے سینڈویچ بھی بنا کر دیے تھے اور رات کو کھانے کے بعد دیر تک آپ اس بڑے مسافر سے باتیں کرتے رہے جو آج صبح جن اپنے جہاز کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

”اچھا تو پھر میں پیر کو کیا کرتا رہا؟ میں نے بوجھا۔ اس دن بھی جناب بنے سا دلوان باہر ہی گھومنا تھا۔ آپ مجھ سے ایک گھر یا ٹانگ کر لے گئے تھے شاید کسی پرندے کو دفن کرنا تھا۔ ہاں! اسی سبز لوطے کا نام لیا تھا۔ آپ نے مجھے اس لیے بھی یاد ہے کہ آپ اس رات جہت دیر سے لوٹے تھے۔

اچھا! تو آپ جلد ہی میری ایل لائیے۔ میں واپس بارہا ہوں، آج اور ابھی، مسٹر شیونڈی میں کو اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے میں نے رسالے کی وہی جلد نکالی جن میں مشمولہ تاریخ کی تصویر تھی۔ جلد جلد تاریخ آٹھ گھر اس کہانی کے انتقام پر پہنچا تو یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہاں اس قسم کی کوئی تصویر موجود نہ تھی۔ میں زور زور سے چیخا چاہتا تھا، لیکن یہ شکل تمام اگلے آپ پر قابو رہا اور رسالے کی اجبتا میں منتہا دیکھنے شروع کر دیے۔ مندرجات کے مطابق اس تصویر کو کیپٹن سمیت موجود ہونا چاہیے تھا اور جب رسالے کو اپنی تاریخ آٹھ پلٹ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ تصویر والا عنصر گئے ہوئے صفائی سے بھاڑ لیا ہے۔ رسالہ مندر کے تقریباً دو تہا ہونے پر اڑا اور میں نے قومی اسٹیشن پر کچھ کر دیا گاڑی پر کچھ امداد کے نہ ہوتا بلکہ پولیس اسٹیشن باکو پولیس انسپکٹر کو پوری کہانی من و عن شادی۔ پہلے تو انسپکٹر کو میری کہانی پر یقین ہی نہ آیا پھر وہ مجھے پاگل سمجھتا رہا، لیکن جب میں نے اپنا تصدیق کا ڈیجیٹ کیا

تو اسے ملتے ہی بڑھ اسی وقت دو مددگاروں کے ہمراہ میرے ساتھ ملائے ہو گیا اور دوسرے دن کی سرگرم نقیض سے غاصے حوصلہ فروختا کر برآمد ہوئے۔ لاش میری بتائی ہوئی جگہ سے مل گئی ہے۔ وہی چٹان کی دراز میں تھوڑی سے جگہ کھود کر اس پر لٹکا سے چھپا پایا گیا تھا کہ اگر نشان دہی نہ کی جاتی تو قیامت تک کسی کو معلوم نہ ہو سکتا۔

وہ دن نقیض ایک عجیب کپڑے کی شہادت ملے سارا کامیاب کر دیا۔ اس نے بتایا کہ جو میں سمجھتا تھا کہ میں وہاں دو آدمی گرتے دیکھے تھے جن میں سے ایک باوری کے پاس میں تھا اور دوسرے کا خلیہ بیرونی ملاؤں کا ساتھ میں سے انہیں پکارتا لیکن وہ رُکے نہیں، شاید قاتل زیادہ تھا اور آٹھ گھر اس تک نہ پہنچ سکی۔ وہ باوری میں ہی تھا میرے پاس سے یہ پورے چٹان میں کی گئی اور کئی ہزار کٹرول کو کرکٹ میسج کر لیا گیا اور مجھے فوراً طور پر صحت مند قرار دیا گیا۔ آخر کار یہ ثابت ہوا کہ قاتل کی یہ واردات میرے پہلے گشتہ دن کے دوران مجھ سے سرزد ہوئی تھی اور اسے چھپانے کی حرکت دوسرے گشتہ دن میں ہوئی تھی۔ میرے پاس میں کچھ نہ جانتے تھے مجھے بھی اس فیصلے پر سہمہ لگایا تھا کہ پورے مجھے یقین ہو چلا تھا کہ سب کچھ میں سے سرزد ہوا ہے۔ اگلا میری ضرورت تھا کہ میری اس غریب تلاش سے کچھ کوئی ملاقات نہ ہوئی تھی اور اس سے میری کوئی دشمنی تھی اور میری کین ایڈورڈ کے انڈیا اور اس کی ہنگاموں کی چھ کچھ یاد آئی تو اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ تو کیا مجھے کسی شیطانی قوت نے اپنا آلہ کار بنایا تھا؟ کین کیس نے اپنی بات منوانے کے لیے تو نہیں نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا، لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ عمر قید کی سزا جھگڑنے سے لے کر کچھ تک میرا کوئی دن گم نہیں ہوا رہا ہونے کے بعد جب میں سیدھا اپنے چرچا میں ایڈورڈ کیس سے ملنے گیا تو معلوم ہوا کہ وہ اس دن سے غائب ہے جس دن مجھ سے ایک معلوم اور بے گناہ ملازم قتل ہوا تھا۔

